STRAY REFLECTIONS

منتشر خیالاتِ اقبال

(علامہ اقبال کی انگریزی بیاض کا اُردو ترجمہ)



مرتبہ:
ڈاکٹر جاوید اقبال

مترجم:
میاں ساجد علی

STRAY REFLECTIONS

منتشر خیالاتِ اقبال

(علامہ اقبال کی انگریزی بیاض کا اُردو ترجمہ)

مرتبہ

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

مترجم

میاں ساجد علی

بُک کارنر

جہلم۔ پاکستان

Muntashir Khayalat-e-Iqbal
by Dr. Muhammad Iqbal
Jhelum: Book Corner. 2016
192p.
1. Iqbaliyat - Diary
ISBN: 978-969-662-036-5

اشاعتِ اوّل	:	نومبر 2015ء (علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی)
اشاعتِ دوم	:	مارچ 2016ء (بک کارنر جہلم)
نام کتاب	:	منتشر خیالاتِ اقبال
مرتبہ	:	جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال
مترجم	:	میاں ساجد علی
سرورق	:	ابوامامہ
مطبع	:	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز،
جہلم، پاکستان

Publisher:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.
Phone # 0544-614977 / 0544-621953
Cell # 0323-5777931 / 0321-5440882
Email: bookcornershowroom@gmail.com

www.bookcorner.com.pk

www.facebook.com/bookcornershowroom

فہرست

پیش گفتار

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شخصیت پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ کئی حوالوں سے ان کے ہمہ جہتی پہلوؤں کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کے فکر وفن کی کئی پرتیں تحقیق وتنقید کا موضوع بنتی رہی ہیں اور آئے روز اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کیوں کہ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ مشرقی روایات کے امین مفکر، مدبر سیاست دان، دانائے راز مصلح اور سب سے بڑھ کر اسلام، قرآن اور صاحبِ قرآن سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔

انہوں نے زبان وقلم سے اس دور میں عالمِ اسلام بالخصوص مسلمانانِ برصغیر کی فکری ونظریاتی رہنمائی کی، جب ہر طرف مغربی تہذیب کی ظاہری چکا چوند نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ خود اقبال کی صورتِ حال یہ تھی کہ وہ مشرق ومغرب کے مے خانہ علم وحکمت کے جام سے سرشار تھے۔ ایک طرف قرآن وسنت اور اسلاف کے افکار وآثار سے گہری شناسائی وآگاہی رکھنے کی بنا پر ''محرمِ راز درونِ خانہ'' کے منصب پر فائز تھے تو دوسری طرف وہ مغرب کے فکر وفلسفے پر پوری مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی وادبی دُنیا میں ان کے اقوال، آثار، احوال اور افکار یکساں طور پر درجہ استناد رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب چوں کہ ان کی کوئی باضابطہ تحریر نہیں، اس لیے یہ کسی خاص موضوع کا احاطہ تو نہیں کرتی لیکن اس کی اہمیت وافادیت اس حوالے سے بہت زیادہ ہے کہ ہم اقبال کے اس دور کے افکار سے روشناس ہوتے ہیں، جب وہ یورپ سے وطن واپس آئے تھے، ان کی ذاتی ڈائری میں درج چند جملے یا چند پیراگراف ان کی فکری رسائی کے غماز ہیں۔ یہی وہ خیالات ہیں جن کو انہوں نے بعد میں اپنی نظم ونثر میں کافی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ میاں ساجد علی جو کہ اقبال سے اٹوٹ وابستگی رکھتے ہیں۔ ان کی اقبال کے یادگاری ڈاک ٹکٹوں اور سکوں پر مشتمل کتاب ''نقش ونگارِ اقبال'' بھی اقبال سے محبت کی ہی دلیل ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''منتشر خیالاتِ اقبال'' اقبال کی ذاتی بیاض Stray Reflections کا سلیس، رواں اور معیاری اُردو ترجمہ بھی میاں ساجد علی کے قلم سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔

ترجمہ کس قدر شگفتگی اور عمدگی کا حامل ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

Self-Control in individuals builds families; in communities, it builds empires.

*ضبطِ نفس افراد میں ہوتو خاندان تعمیر ہوتے ہیں' اقوام میں ہوتو سلطنتوں کی تعمیر ہوتی ہے۔

Philosophy ages; Poetry rejuvenates.

*فلسفہ بوڑھا کرتا ہے جبکہ شاعری تجدیدِ شباب کرتی ہے۔

Justice is an intestimable treasure; but we must guard it against the thief of mercy.

*انصاف ایک بیش بہا خزانہ ہے لیکن ہمیں رحم کی مداخلت کے خلاف اس کا تحفظ کرنا چاہیے۔

Individuals and nations die; but their children, i.e.ideas, never die.

*افراد اور اقوام کو فنا ہے لیکن ان کی اولاد یعنی خیالات وتصورات کبھی نہیں مرتے۔

Recognise your limitations, estimate your capacities and your success in life is assured.

*اپنی حدود کو پہچانو' اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگاؤ اور پھر زندگی میں آپ کی جیت یقینی ہے۔

Nations are born in the heart of Poets; they prosper and die in the hands of Politicians.

* قومیں شعرا کے دلوں میں جنم لیتی ہیں ان کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں جب کہ وہ سیاست دانوں کے ہاتھوں مرجاتی ہیں۔

History is a sort of huge gramophone in wich the voices of nations are preserved.

* تاریخ ایک بہت بڑے گراموفون کی طرح ہے جس میں اقوام کی آوازیں محفوظ ہیں۔

یہ چند مثالیں ترجمے کی سلاست، روانی اور عمدگی کو واضح کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم ترجمہ نہیں پڑھ رہے بلکہ اقبال کے اُردو میں لکھے گئے جملے پڑھ رہے ہیں۔ کسی ترجمہ نگار کی یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ اصل اور ترجمے میں فاصلہ نہ پیدا ہونے دے۔ میاں ساجد علی اس سلسلے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ مزید برآں کتاب میں تشریحی حواشی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

ادارہ بک کارنر جہلم، اقبال کے فکر وفن پر درجنوں بلند پایہ شاہکار شائع کر چکا ہے۔ حال ہی میں پاکستان میں پہلی مرتبہ شائع ہونے والی چار ضخیم جلدوں میں ''کلیات مکاتیبِ اقبال'' کو لوگوں نے شکریے کے ساتھ سراہا۔ یہ کتاب بھی اس کے علمی و ادبی سفر کے تسلسل کی ایک خوب صورت کڑی ہے۔ صاحبانِ ذوق یقیناً اسے تحسین کی نظر سے دیکھیں گے۔

پروفیسر سیّد امیر کھوکھر

دیباچہ

زیرِ نظر کتاب علامہ اقبال کی ذاتی ڈائری Stray Reflections کا ترجمہ ہے۔ اس ڈائری کے مسوّدے کو پہلی مرتبہ محترم ڈاکٹر جاوید اقبال نے دریافت کر کے اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ اپنی مخصوص علمی وجاہت کی بنا پر یہ کتاب اقبال سکالرز میں بہت مقبول ہوئی۔ فاضل مترجم میاں ساجد علی نے اس کا ترجمہ 'منتشر خیالاتِ اقبال' کے عنوان سے اُردو زبان میں کیا ہے۔ اپنی اس علمی کاوش کے دوران میاں صاحب نے بنیادی متن کے ساتھ کہیں کہیں توضیحات اور حواشی کا اضافہ کیا ہے جن کی مدد سے ایک عام قاری کو بعض مشکل الفاظ وتصوّرات، غیر مانوس اشارات اور حوالہ جات کے سمجھنے میں یقیناً آسانی ہوگی۔

اس امر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کہ کسی صاحبِ علم اور خاص طور پر کسی مفکر کی ذاتی ڈائری اس کے فکر وفلسفے کی تفہیم کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مشتملات کو بعض اوقات اس کی باقاعدہ سوچی سمجھی تصنیفات اور تحقیقی مضامین سے بھی زیادہ پُر مغز، اثر انگیز اور بصیرت افروز قرار دیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات ایک مختصر سا تنہا جملہ جو کسی لمحے اس مفکر کے ذہن پر الہامی طور پر اِرتجالاً وارد ہوتا ہے اور جسے وہ ضبطِ تحریر میں لے آتا ہے۔ اس کے عمومی زاویہ نگاہ کو پوری جامعیت کے ساتھ اپنے اندر سموئے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ اس جملے کو عنوان ٹھہرا کر اُس مفکر کے فلسفۂ حیات کے کسی متعلقہ پہلو کی وضاحت میں بڑی آسانی کے ساتھ ایک مستقل اور مفصل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ میری رائے

میں علامہ اقبال کے ان مطبوعہ منتشر خیالات میں سے بیشتر رشحات پر یہ بات پورے یقین کے ساتھ صادق آتی ہے۔

کسی بھی مصنف کی تحریر کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا انتہائی دشوار، محنت طلب اور صبر آزما کام ہوتا ہے؛ جس پر سوچ سمجھ کر ہی ہاتھ ڈالا جانا چاہیے۔اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے مترجم کو اپنے بارے میں یقین ہونا چاہیے کہ ترجمے کے ضمن میں ضروری شرائط کے طور پر اسے چند ایک ناگزیر مہارتوں پر کافی دسترس حاصل ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اُسے نفس تحریر کے موضوعاتی آہنگ اور اس کی فکری فضا سے خاطر خواہ آشنائی میسر ہونی چاہیے۔اس نکتے کی صراحت یوں کی جاسکتی ہے کہ مثال کے طور پر ایک شخص کو جس نے سال ہا سال محض طبیعیاتی علوم کے ہی مطالعے یا درس و تدریس اور ان علوم کی تجربہ گاہوں میں گزارے ہوں وہ مابعد الطبیعیات یا تصوف کے دقیق مسائل پر لکھی جانے والی ایک کتاب کو کسی دوسری زبان میں ڈھالنے کا کس طرح اہل قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں متعلقہ زبانوں میں سے ہر ایک کے الفاظ کی ثروتِ مفاہیم اور ان کے ثقافتی پس منظر اور ساتھ ہی ساتھ ہر زبان کی مخصوص اور منفرد نزاکتوں، لطافتوں اور بین السطور معنویت کے امکانات سے مترجم کا آگاہ ہونا بھی ضروری ہے تا کہ ترجمہ کرتے ہوئے انتقالِ مفہوم کا حق پوری دیانت کے ساتھ ادا ہو سکے۔ اس آگاہی کی غیر موجودگی میں محض لغات (Dictionary) پر انحصار کرنا گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے ۔ اور سب سے ضروری بات : ترجمہ کرنے کے بعد جو تحریر معرضِ وجود میں آئے اس کے مجموعی تاثر اور خوبصورتی کا ایک الگ سے معیار یہ بھی ہے کہ مکمل صحت ترجمہ کے باوجود پڑھنے والے کو اس کے مطالعہ کے دوران 'ترجمے' کا احساس نہ ہو بلکہ وہ ترجمہ اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف کا تاثر پیدا

کرے۔ کسی بھی دوسری زبان میں لکھی گئی کتاب کے ترجمے کو ایک عام قاری کے لیے قابلِ مطالعہ بلکہ قابلِ برداشت بنانے کی خاطر اُس کا اس آخری معیار پر پورا اُترنا نہایت ضروری ہے۔

Stray Reflections کے دو ایک ترجمے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں جو یقیناً موجودہ مترجم کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں میاں ساجد علی نے اچھے ترجمے کی شرائط اور معیارات کو ملحوظ رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اگر ایک کتاب کو نئے نئے مترجم ملتے رہیں تو استکمالِ فہم کی جستجو میں قاری کو ترجمے کے مثالی تصور کے قریب سے قریب تر تراجم مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو عام قارئین بالعموم اور اقبال سکالرز بالخصوص تحسین کی نظر سے دیکھیں گے اور فکرِ اقبال سے آشنائی کے فروغ کے ضمن میں اسے ایک مفید پیش رفت قرار دیا جائے گا۔ جس قدر محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ اس مفید علمی کاوش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے؛ یقیناً قابلِ داد ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے میاں ساجد علی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں کہ وہ اس نوعیت کی کاوشیں آئندہ بھی جاری رکھیں۔

ڈاکٹر عبدالخالق

سابق صدر پاکستان فلسفہ کانگرس

وسابق صدر شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پیش لفظ

علامہ اقبال کی شخصیت ایک مفکر کے طور پر نمایاں ہے مگر ہم نے ان کو محض ایک شاعر کے طور پر ہی جانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ گزشتہ صدی اور اسلامی تاریخ کے بہت بڑے شاعر تھے۔ میرے خیال میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی فکر کو پھیلانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ اس مقصد کے لیے شاعری انہیں الہام کی گئی تھی:

نغمہ کجا و من کجا' سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را
(زبورِ عجم)

ان کے فکر کی ایک جھلک ہمیں ان کی ذاتی بیاض میں موجود ان ایک سو پچیس ''منتشر خیالات'' میں بھی ملتی ہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں قیام اقبال کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا؛ جس میں انہوں نے مغربی تہذیب کا مشاہدہ کیا اور وہاں کے نامور شعرا اور فلسفیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ وطن واپسی پر ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں کوئی نظم نہ سنائی' البتہ انگریزی میں لیکچر دیئے جبکہ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے انجمن کے سالانہ اجلاس میں کسی بھی قسم کی شرکت سے گریز کیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۰۹ء سے گورنمنٹ کالج' لاہور میں عارضی طور پر فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا۔ لیکن وکالت بھی ساتھ ساتھ چلتی

رہی۔فلسفہ پڑھانے کے دوران انہوں نے ۱۹۱۰ء سے اپنی ذاتی بیاض میں انگریزی نوٹ درج کرنے شروع کر دیئے جو ان کے فلسفیانہ تخیلات کے مظہر ہیں۔اس ذاتی بیاض کے سرِ ورق پر ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کی تاریخ درج کی جبکہ انگریزی میں ''سٹرے تھاٹس Stray Thoughts'' لکھا لیکن اسے قلم زد کر کے ''سٹرے ریفلکشنز Stray Reflections'' کر دیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اقبال گورنمنٹ کالج، لاہور کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سبکدوشی کے متعلق وہ پہلے سے سوچ رہے تھے۔ چنانچہ عطیہ فیضی کے نام ایک خط محررہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء میں تحریر کرتے ہیں:

''حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں مختلف امور پر مالی نقطۂ نظر سے غور کروں اور یہ نقطۂ نظر وہ ہے، جس سے چند برس پیشتر مجھے دلی کراہت تھی۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ خدائی امداد پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے قانونی پیشے کو جاری رکھوں گا''۔

(اقبال از عطیہ بیگم، صفحہ ۵۲)

گورنمنٹ کالج، لاہور سے سبکدوشی کے موقع پر کالج کی طرف سے انہیں ایک الوداعی دعوت دی گئی اور انہوں نے طلبہ کو 'رابرٹ براؤننگ کی شاعری' کے موضوع پر اپنا آخری لیکچر دیا۔

(پنجاب گزٹ، ۲۰ جنوری ۱۹۱۱ء حصہ اول، صفحہ ۳۲)

اپنی ذاتی بیاض میں بھی جس شخصیت کا ذکر سب سے آخر میں کرتے ہیں وہ رابرٹ براؤننگ ہی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دورانِ ملازمت فلسفہ

پڑھانے کے ساتھ ساتھ ان خیالات کو اپنی ذاتی بیاض میں درج کرتے رہے اور ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی یہ سلسلہ بھی بند کر دیا۔ یہ خیالات ان کی فلسفیانہ سوچ کے مظہر ہیں ۔ان خیالات میں گوئٹے کا ذکر سب سے زیادہ ہوا ہے اور اُس کی قوم اہلِ جرمنی کو اقبال نے خوش نصیب قوم کہا ہے جس کی وجہ یورپ میں قیام کے دوران جرمن ادب سے لگاؤ تھا۔ اقبال کو جرمن ادب سے اس بنا پر وابستگی پیدا ہوئی کہ اس میں مشرقی تحریک' یورپ کے دیگر ممالک کے ادب کی نسبت زیادہ دلکش اور موثر تھی۔ جرمن ادب میں مشرقی تحریک کا آغاز ہیرڈر کی تصنیف 'گلہائے چیدہ از کلام شاعرانِ مشرق' سے ہوا۔ جس میں حافظ' سعدی' رومی اور بھرتری ہری کے اشعار اور ہتیوپدیش اور بھگوت گیتا کی حکایات کا آزاد ترجمہ تھا۔ بعد میں گوئٹے اس تحریک کی طرف متوجہ ہوا۔ گوئٹے فارسی' عربی اور سنسکرت ادب سے متاثر تھا۔ اس کی خالصتاً مغربی تصنیف 'فاؤسٹ' کے ابتدائیے میں کالی داس کی 'شکنتلا' کا اثر نمایاں ہے۔ دیوانِ حافظ کے مطالعے سے گوئٹے کو 'دیوانِ مغرب' لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ وہ حافظ کے علاوہ رومی' سعدی' فرید الدین عطار اور فردوسی کے کلام نیز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور قرآن مجید کی تعلیمات سے بھی متاثر تھا۔ اس کے دیوان میں فارسی تشبیہات اور استعارات اس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ اشعار میں مشرقی فضا پیدا ہو گئی۔ علامہ اقبال نے اپنی اس بیاض میں جہاں بھی جرمن شاعر گوئٹے کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے اس کا نام 'Goethe' کی بجائے 'Geothe' تحریر کیا ہے۔

یورپ میں قیام کے دوران اقبال نے کل چوبیس نظمیں اور سات غزلیں کہیں جو بانگِ درا کے حصہ دوم کی زینت ہیں۔ قیامِ یورپ کے دوران اقبال میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا' وہ ان کا وطنی قومیت اور فلسفہ وتصوف سے منتشر ہو کر ذہنی اور قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اقبال میں مغرب زدگی

یورپ جانے سے قبل تھی نہ قیامِ یورپ کے دوران آئی۔ان کی نظر محققانہ تھی؛ اس لیے ان میں مغرب کی کورانہ تقلید کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔ انہوں نے یورپ کے ظاہری حسن کا تماشا ضرور کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے باطن پر بھی گہری نگاہ ڈالی ۔عقلی علوم' سائنس اور ٹیکنالوجی کی کرشمہ سازیاں بھی دیکھیں' مگر ساتھ ہی مشاہدہ کیا کہ یورپی علم و ہنر کا منتہائے نظر تن ہے' من نہیں۔یعنی یورپ میں دماغ کی تربیت تو ہو جاتی ہے لیکن دل تشنہ رہ جاتا ہے۔یورپ کی زیرکی کی بنیاد مادہ پرستی پر استوار کی گئی ہے۔اس کا نصب العین مفاداندوزی ہے اور وہ اس جذبۂ عشق سے محروم ہے جو روح کے اندر حقیقی معنوں میں احترامِ آدمیت یا انسان دوستی کا خلاق ہے اور ارتقائے حیات کا ضامن ہے۔اس لیے ان کی مشرقی بصیرت نے بھانپ لیا کہ یورپ کی تہذیب میں خرابی کی صورت مضمر ہے اور اس کی تجلی عارضی نوعیت کی ہے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
(بالِ جبریل)

میرے لیے ان ''منتشر خیالات'' کا ترجمہ کرنا ایک ملی فریضہ کی طرح ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور جملوں کی ساخت میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ یہ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے افکار کی صحیح ترجمانی کریں اور ان کی فکر کے عکاس ہوں ۔ممکن ہے کہ اس ترجمہ میں کوئی کمی رہ گئی ہو کیونکہ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے ان خیالات کا حق سو فیصد ادا کر دیا ہے لیکن میری اس کوشش کو ماہرینِ اقبال اور فلسفہ کا مطالعہ کرنے والے بے حد پسند فرمائیں گے۔میں اس ترجمے کی

تکمیل کے لیے محترم عبدالخالق کا بے حد شکر گذار ہوں جنھوں نے اس ترجمے کی درستی میں بھرپور تعاون عنایت فرمایا۔ ۱۹۶۱ء میں فرزندِ اقبال جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی اس بیاض کو شائع کیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک تفصیلی نوٹ بھی لکھا تھا۔ جو اس ترجمے کے آغاز میں شامل ہے۔ اس تفصیلی نوٹ کا ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی کتاب سے حاصل کیا گیا ہے کیونکہ مقصود علامہ اقبال کی بیاض کا ترجمہ تھا نہ کہ فرزندِ اقبال کے نوٹ کا۔ البتہ تفصیلی نوٹ میں کچھ حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر افتخا ر احمد صدیقی نے ان خیالات کا ترجمہ 'شذراتِ فکرِ اقبال' کے نام سے کیا جسے مجلسِ ترقی ادب' لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق نے 'بکھرے خیالات' کے نام سے کیا جو بھارت میں ۱۹۷۵ء شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق کا ترجمہ پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ کتاب کے آخر میں علامہ اقبال کی اِس بیاض کی نقل منسلک کی گئی ہے۔ جس میں واضح طور پر ان کی تحریر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اصل بیاض علامہ اقبال میوزیم (جاوید منزل)' علامہ اقبال روڈ' لاہور میں محفوظ ہے۔

میاں ساجد علی

چیئرمین علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی

allamaiqbalstamps@gmail.com
www.allamaiqbalstamps.blogspot.com
www.facebook.com/allamaiqbalstamps



تعارفی نوٹ

(ڈاکٹر جاوید اقبال)

یہ بیاض محمد اقبال کے کاغذات میں اب تک پڑی تھی۔ بیاض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو اس میں لکھنا شروع کیا تھا؛ کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رکھا اور پھر نہ جانے کیوں ختم کر دیا۔ انھوں نے اس بیاض کے سرورق پر ''سٹرے ریفلیکشنز'' کا عنوان درج کیا تھا۔[1] یہ ان متفرق تحریروں پر مشتمل ہے جو اُس زمانے میں زیرِ مطالعہ کتب کے تاثرات' یا اپنے ماحول کے بارے میں ان کے خیالات واحساسات اور ایامِ طالبِ علمی کی یادوں پر مبنی ہیں۔

اگرچہ ہمیں ان کے بعض خیالات سے اختلاف ہو' تاہم اس بیاض میں اقبال کے ذہن کی توانائی' ہمہ گیری اور خلاقی کی جھلک نظر آئے گی۔ یہاں ہم ان کی دلچسپیوں کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کریں گے اور متنوع موضوعات مثلاً آرٹ' فلسفہ' ادب' سائنس' سیاست اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات سے آشنا ہوں گے۔ انھی اوراق میں انھوں نے محکوم قوم پر سامراج کے نفسیاتی اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اقبال کا اسلوب بہت سادہ' دوٹوک اور پُر زور ہے۔ بعض اوقات ان کی تحریر کی برجستگی ہمیں چونکا دیتی ہے۔ عموماً وہ چند جملوں یا ایک مختصر عبارت میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ نثر اُس شاعر کے اختصار و بلاغت کا آئینہ دار ہے جو معانی کا ایک خزانہ چند لفظوں میں منتقل کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بیاض میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں' ان میں کوئی ربط و تسلسل نہ ملے گا کیونکہ انھیں کسی مقررہ منصوبے کے مطابق قلم بند نہیں کیا گیا۔ تاہم یہ تحریریں شاعر پر اثر انداز ہونے والے بہت سے عوامل و افکار کے فوری اور

۱۔ پہلے اس بیاض کا نام اقبال نے 'سٹرے تھاٹس (Stray Thoughts)' تحریر کیا تھا لیکن بعد میں اس نام کو قلم زد کر کے 'سٹرے ریفلیکشنز (Stray Reflections)' کر دیا۔

حساس ردِ عمل کی عکاسی کرتی ہیں اور اس کے کردار کی پیچیدگی کو کسی حد تک سمجھنے میں ہمیں ان سے مدد ملتی ہے۔ اقبال اُن مفکروں میں سے ہیں جن کے خیالات کی ندرت اور تفکر انگیزی ہمیں پیہم متحیر کرتی ہے۔ لہٰذا اگرچہ ہم میں سے اکثر ان کے عظیم ترین ادبی کارناموں سے آشنا ہیں لیکن ہمیں اس زعمِ باطل میں مبتلا نہ رہنا چاہیے کہ ہم اقبال کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں اقبال کی عمر سینتیس سال تھی[1] اور وہ انارکلی بازار کے ایک بالاخانے میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے اور بیرسٹر ہو کر لاہور آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد ایڈووکیٹ کی حیثیت سے انھوں نے عدالتوں میں پریکٹس شروع کر دی۔ اسی زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر شعبہ فلسفہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد اس عہدے سے مستعفی ہو گئے کیونکہ انھیں محسوس ہوا کہ جب تک وہ سرکاری ملازمت کی بندشوں میں گرفتار رہیں گے، بے باکانہ اظہارِ خیال کی آزادی انھیں حاصل نہ ہو گی۔

۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا۔[2] جدید انڈین کونسلز ایکٹ کے ماتحت جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا اور بہت محدود طور پر اس کا اطلاق ہوا۔ بظاہر ملک کے سیاسی حالات ایسے نہ تھے کہ اقبال جیسے شخص کو، جو برطانوی سامراج کے مخالف اور اقوامِ ہند کی سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کے خواہاں تھے، ملکی خدمت کے مناسب مواقع میسر آتے۔

۱۔ ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے فرزندِ اقبال کے اس نوٹ میں سینتیس سال لکھا تھا کیونکہ ۱۹۷۳ء تک اقبال کے سنِ پیدائش کو ۱۸۷۳ء ہی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۹۲ء میں چھپنے والی اس بیاض کی دوسری اشاعت میں سنِ پیدائش ۱۸۷۷ء کو تسلیم کر کے تینتیس برس لکھا گیا تھا۔ سنِ پیدائش کی یہ درستی سرکاری طور پر ۱۹۷۳ء میں کی گئی تھی۔

۲۔ وائسرائے اور وزیرِ ہند کی تجاویز ۱۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہوئیں۔ یہ تجاویز عوام میں منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے مشہور ہوئیں۔ جن میں جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا گیا تھا۔

اقبال اپنی شدید مالی دشواریوں کے باوجود سرکاری ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے' حالانکہ برطانوی نظامِ حکومت میں اقبال جیسی قابلیت کے آدمی کے لیے بآسانی گنجائش نکل سکتی تھی۔ لہٰذا وہ دلچسپی سے اس امکان کا جائزہ لے رہے تھے کہ کسی مسلم ریاست میں علمی قسم کی خدمت کا موقع نکل آئے تاکہ وہ آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض شروع کرنے سے چند ماہ پیشتر وہ اسی مقصد سے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے(۱) لیکن وہاں کے لوگوں کی مردہ دلی اور انگریزوں کے بارے میں نظام کے خوشامدانہ رویے سے بیزار و مایوس ہو کر لاہور واپس آ گئے۔ اس زمانے میں اقبال نے عطیہ بیگم کے نام جو خطوط لکھے ہیں' وہ ایک ایسے تلخ کام و دل شکستہ انسان کے آئینہ دار ہیں جو معاشرتی رسوم کے ظالمانہ دباؤ کا شکار ہو' کہ اس معاشرے میں ان جیسے تخلیقی افراد کا یہی انجام ہوتا رہا ہے۔ یہ خطوط ابنائے وطن کی ریاکاری' تنگ نظری اور خود پسندانہ اتقا کے خلاف ان کے حقارت آمیز تنفر سے لبریز ہیں۔ وہ عطیہ کو لکھتے ہیں:

> ''میں کسی ملازمت کا خواہاں نہیں۔ میرا تو یہ ارادہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو' اس ملک سے بھاگ جاؤں۔۔۔ میری زندگی نہایت المناک ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی حصولِ مسرت کا حق ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت' مجھے اس حق سے محروم رکھنا چاہے تو میں دونوں سے بغاوت کروں گا۔ اب یہی چارۂ کار باقی ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے اس بدنصیب ملک کو خیرباد کہہ جاؤں' یا مے نوشی میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ بے جان' بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے۔ میری روح کی گہرائیوں میں اتنی آگ دبی ہے کہ ان سب کو' اور تمام معاشرتی رسوم کو بھی' جلا کر راکھ کر دے۔'' (۲)

۱۔ اقبال ۱۹ مارچ ۱۹۱۰ء کو لاہور سے حیدرآباد دکن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء کو واپس لاہور پہنچے۔

۲۔ اقبال از عطیہ بیگم (انگریزی)' صفحات ۳۶' ۳۷

ایک اور خط میں یوں غم و غصہ کا اظہار ہوا ہے:

''میری زندگی سیدھی سادی' دیانت دارانہ زندگی ہے۔ میرا دل میری زبان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لوگ ریاکاری کا احترام اور تعریف کرتے ہیں۔ میں ریاکاری سے حاصل کی ہوئی شہرت' عزت اور عقیدت کے مقابلے میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ گمنامی میں مر جاؤں اور کوئی مجھ پر آنسو بہانے والا نہ ہو۔ رائے عامہ کے عفریت اپنی عقیدت و احترام کی غلاظت اُن لوگوں کو بخش دیں جو ان کے باطل اقدار دینی و اخلاقی کے مطابق عمل کرتے اور زندگی گزارتے ہیں۔ میں اتنا پست نہیں ہو سکتا کہ ان رسوم و روایات کا احترام کروں جو انسانی ذہن کی فطری آزادی کو کچل دیتی ہیں''۔ (۱)

وہ اُن دنوں اتنے معصوم تھے کہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں (اس بیاض کے آغاز سے چند ہفتے پہلے) انھوں نے عطیہ بیگم کو لکھا:

''لیکن اب میرے دل میں شاعری کے لیے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی حسین دیوی کو قتل کر دیا ہے اور میں تخیل سے یکسر محروم کر دیا گیا ہوں۔ اورنگزیب پر میری وہ نظم جو اِن کے مزار کی حالیہ زیارت کے بعد لکھی گئی' شاید میری آخری نظم ہو گی''۔ (۲)

انجمن حمایتِ اسلام کی جانب سے ہر سال اقبال کو سالانہ جلسوں میں نظم سنانے کی دعوت دی جاتی رہی۔ لیکن خلاف معمول ۱۹۱۰ء میں اس موقع پر انھوں نے کوئی نظم نہیں سنائی ۔ ان دنوں انجمن میں کچھ داخلی اختلافات رونما ہوئے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ اس صورتِ حال سے بھی وہ پریشان ہوئے ہوں گے۔ بہر حال اس عرصے میں اقبال نے چند نظمیں لکھیں جو مقامی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ لیکن یہ نظمیں بلند معیار کی نہیں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش

۱۔ اقبال از عطیہ بیگم (انگریزی)' صفحہ ۴۹

۲۔ اقبال از عطیہ بیگم (انگریزی)' صفحات ۶۸' ۶۹

پیش کے حالات سے جو دل شکستگی اور شدید مایوسی انھیں ہوئی' اس کے نتیجے میں اس سال ان کی تخلیق فعلیت معطل رہی۔ ممکن ہے کہ شعر گوئی کی تحریک نہ ہونے کی وجہ سے وہ شاعری کے بجائے اس خیالات نویسی کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں۔ ۱۹۱۰ء کے دوران میں یہی بیاض ان کی خاص تصنیف ہے۔

تخلیقی عمل کی تحیر زائیوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ خاموشی اور پسپائی کے یہ ادوار اکثر اپنے ایک پُر اسرار مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اقبال کی اس ظاہری خاموشی کی تہہ میں یقیناً زبردست طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ اس سے اگلے سال' ۱۹۱۱ء میں شاعر کا داخلی ہیجان ''شکوہ''[۱] کی صورت میں اُبل پڑا۔ اس مشہور نظم میں شاعر زوالِ ملت پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے اور مشیتِ ایزدی کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اس کے بعد شاعر کی تخلیقی فعلیت زیادہ سے زیادہ بیدار و متحرک ہوتی گئی اور تقریباً ہر سال ایک تازہ شاہکار تخلیق پاتا رہا۔ وہ غزل سرا جو محبت کے درد بھرے نغمے گایا کرتا تھا' رفتہ رفتہ دم توڑ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک فلسفی اور مصلحِ اخلاق جنم لے رہا تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت اقبال کی عمر بارہ سال تھی۔[۲] کانگرس کی بنیاد عہدِ وکٹوریا کی انتہا پسندی کے اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ وقت کے ساتھ اس تنظیم کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا' کیونکہ ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کے ذریعے اپنی قوم کے ثقافتی' سیاسی' معاشی اور تعلیمی احیاء کے لیے

۱۔ ''شکوہ'' ۱۶ اپریل ۱۹۱۱ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ' لاہور کے ریواز ہاسٹل کے وسیع صحن میں پڑھی گئی جو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا کی زینت بنی۔

۲۔ اس نوٹ میں بارہ سال لکھا تھا کیونکہ ۱۹۷۳ء تک اقبال کے سنِ پیدائش کو ۱۸۷۳ء ہی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۹۲ء میں چھپنے والی اس بیاض کی دوسری اشاعت میں سنِ پیدائش ۱۸۷۷ء کو تسلیم کر کے آٹھ سال لکھا گیا تھا۔ سنِ پیدائش کی یہ درستی سرکاری طور پر ۱۹۷۳ء میں کی گئی تھی۔

کوشاں تھا۔

لیکن برعظیم ہند کے مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے بالکل مختلف تھی۔ انیسویں صدی میں سیاسی اقتدار مکمل طور پر مسلمانوں سے انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا تھا اور مسلم فقہا نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا۔ سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد کے جانباز مجاہد سرحد میں انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بھڑکانے کا الزام مسلمانوں پر عائد کیا گیا۔ چنانچہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوا تو انگریزوں نے مسلم کُش پالیسی اختیار کی اور ہندوؤں نے اپنے سیاسی و معاشی مقاصد کے پیش نظر انگریزوں کا ساتھ دیا۔

سید احمد خاں کی پُرخلوص اور اَن تھک کوششوں کی بدولت ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا منتقمانہ رویہ تبدیل ہوا۔ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھوں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ مسلمانوں کے قدیم سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی اور معاشی نظام کے ڈھانچے دورِ جدید میں قائم نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، معاشرتی و معاشی ڈھانچوں کی تشکیلِ نو لازمی ہے۔ اس قسم کی نئی تنظیمیں اُس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتیں جب تک مسلمان اپنے فرسودہ تعلیمی نظام کو چھوڑ کر نئے علوم کو نہیں اپناتے اور زندگی کے بارے میں ایک مطلق نیا رویہ اختیار نہیں کرتے۔

ذاتی تجربے سے سید احمد خاں پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ ہندو اکثریت کو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ سید احمد خاں اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ تعلیمِ جدید کے حصول اور اپنی معاشی اصلاح و ترقی پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز رکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو کسی

صورت میں انگریزوں کی تائید وحمایت سے دستبردار نہ ہونا چاہیے۔

۱۸۸۶ء میں سید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگرس کے بالمقابل محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی۔ [1] اس سے اگلے سال انھوں نے اپنی ایک مشہور تقریر میں مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تعلیمی اور معاشی لحاظ سے ان کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لیں۔ سید احمد خاں نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ہندوستان میں جمہوری اصول رائج ہوا تو مسلمانوں کو کلیتاً ہندو اکثریت کا دست نگر ہو جانا پڑے گا۔

۱۸۹۳ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس تلک کے زیر اثر آئی اور اس ہندو قوم پرست کی اشتعال انگیز تقریروں سے بمبئی میں ہندو مسلم فساد بر پا ہوا، تو سید احمد خاں نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس آف انڈیا کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ان کی وفات سے دو سال بعد، ۱۹۰۰ء میں جب ہندوؤں نے ہندی زبان کو اُردو کی جگہ دلانے کی تحریک

۱۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے:

i) مسلمانوں میں یورپین سائنس ولٹریچر کی اشاعت اور اعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا۔

ii) مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا اور اُردو اور انگریزی میں رسالے لکھوانا۔

iii) مشہور علما اور مصنفین اسلامک کے سوانح حیات اُردو اور انگریزی میں مرتب کرنا۔

iv) مسلم مصنفین کی قدیم تصانیف کی فراہمی۔

v) زمانہ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیق واشاعت۔

vi) دنیاوی علوم کے مسائل کی تحقیق واشاعت۔

vii) شاہی فرامین کو جمع کر کے ایک کتاب انشا مرتب کرنا۔

viii) مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔

ix) علوم مشرقی اور دینیات کے علما سے ربط قائم کرنا اور اُن کی تعلیم میں ترقی کی کوشش۔

x) قدیم مکاتب کی اصلاح وترقی۔

شروع کی تو علی گڑھ میں اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔اس سے اگلے سال علی گڑھ میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کی بنیاد پڑی اور اگرچہ یہ تنظیم ۱۹۰۳ء تک قائم رہی لیکن مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے بجائے یہ انگریزوں کی حمایت کا ذریعہ بنی رہی۔

۱۹۰۶ء میں جب اس امر کے آثار نظر آنے لگے کہ انڈین نیشنل کانگرس کے دباؤ سے مجبور ہو کر' انگریز حکومت ہند میں منتخب نمایندگی کی کوئی صورت رائج کرنے والے ہیں تو امرا اور زمیندار طبقے کے کچھ مسلمانوں نے' جو ہمیشہ سید احمد خاں کے سیاسی مسلک کی پیروی کرتے رہے' آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ [1] یہ انقلابی اور ترقی پسندانہ اصولوں کے بجائے قدامت پسندی اور رجعت پرستی کے اصولوں پر مبنی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ' مسلم عوام سے کوئی زندہ رابطہ استوار کرنے میں ناکام رہی۔ بہر حال اس کا کارنامہ یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کے لیے مسلمانوں کا مطالبہ اسی جماعت کی کوششوں سے منظور ہوا۔

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے اس دور میں جو تنظیمیں قائم ہوئیں؛ ان کے مقاصد محدود تھے۔ انھیں سیاسی تنظیمیں نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کا دائرہ عمل مسلمانوں میں جدید تعلیم کی نشر و اشاعت' انگریزی حکومت کی غیر مشروط حمایت اور ہندو اکثریت کی ابھرتی ہوئی طاقت کے خلاف مدافعت کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ اس طرح اگرچہ سید احمد خاں کی زندگی میں' اور ان کی وفات کے بعد بھی' مسلمانوں کے طبقہ اعلیٰ اور زمینداروں کی پرانی اور نئی نسلیں انھی کے سیاسی مسلک کی حامی رہیں لیکن متوسط طبقے کے مسلم نوجوان' سید احمد خاں کی وفات کے محض چند سال بعد تک ان راہوں پر گامزن رہے اور پھر ان سے منحرف ہو گئے۔

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں ہوا۔

اقبال کا تعلق اسی متوسط طبقے کے نژادِ نو سے تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں مولانا سید میر حسن کے زیرِنگرانی حاصل کی جو سید احمد خاں کے پُرجوش حامی تھے' لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کی وساطت سے اقبال اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں علی گڑھ تحریک سے آشنا ہوئے اور اس کے مقاصد کے حامی رہے۔ بائیس سال کی عمر میں وہ بغرضِ تعلیم سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ [۱] دیگر حساس نوجوانوں کی طرح اقبال بھی اپنے دور کی الجھنوں اور مایوسیوں کا شعور رکھتے تھے۔ عالمِ اسلام کی پس ماندگی کا حال بھی ان سے پوشیدہ نہیں تھا۔

سلطنتِ عثمانیہ کی بنیادیں متزلزل تھیں' وسطِ ایشیا کی مسلم جمہوریتیں زارروس کی سلطنت میں ضم ہو چکی تھیں ۔ ایران میں قدیم شاہی خاندان روبہ انحطاط تھا اور ملک کی معیشت تباہ ہو رہی تھی۔ چین میں مسلم اکثریت کے صوبے چینی سلطنت میں مدغم ہو چکے تھے اور وہاں کے مسلمان ایک نمایاں سیاسی وجود کی حیثیت کھو بیٹھے تھے۔ مشرقی یورپ کے علاقوں سے بھی مسلمان رفتہ رفتہ نکالے جا رہے تھے۔ مصر' برطانیہ کی ٹھوکروں میں پامال ہو رہا تھا۔ فرانس' مراکش کو ہڑپ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ڈچ' سیاسی اور وحشیانہ مظالم ڈھا رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے خاتمے پر برعظیم ہند کے مسلمان اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور سیاسی اقتدار کی بازیابی سے مطلق نااُمید ہو چکے تھے۔

۱۔ ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے فرزندِ اقبال کے اس نوٹ میں بائیس سال لکھا تھا؛ کیونکہ ۱۹۷۳ء تک اقبال کے سنِ پیدائش کو ۱۸۷۳ء ہی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۹۲ء میں چھپنے والی اس بیاض کی دوسری اشاعت میں سنِ پیدائش ۱۸۷۷ء کو تسلیم کر کے اٹھارہ سال لکھا گیا تھا۔ سنِ پیدائش کی یہ درستی سرکاری طور پر ۱۹۷۳ء میں کی گئی تھی۔

اس عالمِ یاس و ہراس میں، مسلمانانِ ہند کی آنکھیں، ملی اتحاد کی تحریک پر لگی ہوئی تھیں۔ اس تحریک کی مرکزی قیادت خلیفہ عثمانی کے ذمے تھی، جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے واحد آزاد حکمران تھے۔ لیکن یورپ کی استعماری طاقتیں مسلم تہذیب کی اس آخری یادگار کو بھی مٹانے پر تلی ہوئی تھیں۔ انگریز یونانیوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہے تھے اور اس وجہ سے انگریز حکمرانوں کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کی کشیدگی بڑھ گئی تھی۔

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے تباہ کن اثرات کے پیشِ نظر، سر سید احمد خاں ہمیشہ فکرمند رہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی اور سیاسی شورش سے مسلمانوں کو دُور رکھیں۔ انھوں نے مسلم قوم کی پُر امن ترقی اور بہبودی کا جو حرم تعمیر کیا تھا، اس کی حفاظت کا انھیں خاص خیال تھا۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو ان سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی، جن سے عالم اسلام میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

جمال الدین افغانی جب ۱۸۸۲ء میں ہندوستان آئے تو سید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اول الذکر کے ولولہ انگیز پیغام کو مسترد کر دیا۔ بین الملی اتحاد کی تحریک بیش تر جمال الدین افغانی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ انھیں یقین تھا کہ مسلمانوں کے درمیان وحدتِ مقاصد ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے یورپی سامراج کو شکست دینے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسلامی دنیا کے بعض عناصر نے ان کے پیغام پر لبیک کہا اور ان کے خیالات کی تبلیغ کے لیے متعدد انجمنیں قائم ہوئیں۔

سید احمد خاں اور ان کے رفقا کے مخالفانہ رویے کے باوجود بہت سے مسلم نوجوانوں نے جمال الدین افغانی کی دعوت کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ چنانچہ جب وہ واپس گئے تو معتقدین کی ایک جماعت اپنے پیچھے ہندوستان میں چھوڑ گئے۔ اقبال بھی مسلم نوجوانوں کی اسی جماعت کے ایک رکن تھے جو جمال الدین

افغانی کے تصورِ اتحادِ ملی سے بغایت متاثر ہوئی۔

۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۴ء تک کے پنج سالہ دور میں اقبال نے کئی قومی نظمیں لکھیں جن میں انھوں نے اسلامیانِ ہند کی افسوس ناک حالت پر آنسو بہائے اور مسلمانانِ عالم کے مصائب پر بھی ماتم کناں ہوئے' جو ہر جگہ آزادی کی صبر آزما کشمکش میں مبتلا تھے۔ تصویر درد[۱] فریادِ اُمت[۲] اور نالہ یتیم[۳] وغیرہ نظمیں ان کے ملی جذبات کی مظہر ہیں۔

یورپ میں اقبال کا قیام ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رہا۔ اس عرصے میں ان پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ بین الملی اتحاد ہی احیائے اسلام کی واحد امکانی صورت ہے۔ انھوں نے اپنے گردوپیش ہر طرف مسلمانوں کی شکست وریخت کا منظر دیکھا اور کچھ ایسے آثار نظر آ رہے تھے کہ بہت جلد آزاد اسلامی حکومت کا کوئی نشان صفحہ عالم پر باقی نہ رہے گا۔

اسلامی اتحاد کے نصب العین کو اپنانے سے پہلے اقبال کے فلسفیانہ اور سیاسی تصورات ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر چکے تھے۔ مثلاً اسی بیاض میں ایک جگہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ دورانِ تعلیم میں ورڈز ورتھ نے انھیں دہریت سے بچا لیا۔ زمانہ طالب علمی کا یہ رجحان ان کے ذہنی تجسّس اور تلاشِ حقیقت کی دلیل ہے۔ وہ کسی بات کی صحت وصداقت کو دوسروں کی سند کے حوالے سے ہرگز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ صوفیائے اسلام اس قسم کی دہریت کو ''حجاب'' سے تعبیر کرتے ہیں' اور ان کے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا حجاب وہ ہے جسے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ گویا اس شخص کے قلب پر مہر لگ گئی ہو۔ یہی وہ مستقل دہریت ہے

۱۔ ''تصویرِ درد'' انجمن حمایتِ اسلام' لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۴ء میں پڑھی گئی۔

۲۔ ''فریادِ اُمت'' انجمن حمایتِ اسلام' لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۰ء میں پڑھی گئی۔

۳'' نالہ یتیم'' انجمن حمایتِ اسلام' لاہور کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۳ء میں پڑھی گئی۔

جو جامد اور نا قابلِ اصلاح ہے۔ دوسری قسم ''حجابِ حق'' ہے۔ یہ ایسی دہریت ہے جو وجہِ جواز رکھتی ہے کہ اس کا آغاز تشکیک سے ہوتا ہے اور انجام ایمان پر۔ ایسے شخص کا باطنی وجود، عرفانِ حق اور امتیازِ خیر و شر کے حصول کے لیے پیہم کوشاں رہتا ہے۔ یہ دہریت ایک متجسّس ذہن کے سفرِ ارتقا میں ایک عارضی مرحلہ ہے۔ عظیم ترین مفکرین اسلام میں سے بیش تر، نیز دیگر مذاہب کے متعدد حکما و شعرا یکساں طور پر اس کیفیت سے دوچار ہوئے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اقبال کی تعلیم و تربیت روایتی اسلامی نہج پر ہوئی تھی تو ورڈز ورتھ نے انھیں کیوں اس طرح متاثر کیا؟ اقبال کا ذوقِ تجسّس اس امر کا شاہد ہے کہ وہ خود اپنی روایات کی تنگ اور محدود فضا کو خیر باد کہہ دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ چونکہ وہ بھی اس ذہنی خلفشار سے دوچار تھے جس میں انیسویں صدی کا یورپی فکر مبتلا تھا، لہٰذا اگر انھوں نے متجسس ذہن کے دیگر افراد مثلاً جان اسٹورٹ مل کی طرح ورڈز ورتھ کے مطالعے میں عقلیت کے کھوکھلے پن کا ایک قابلِ فہم جواب پایا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ ان کی سلامتیِ عقل کی دلیل ہے کہ وہ اپنے عہد کے عام جمالیاتی اور مادہ پرستانہ رجحانات سے متاثر ہو کر زیادہ بہکے نہیں۔

اسلامی تصوف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ورڈز ورتھ کے خیالات، شیخ محی الدین ابن عربی کی وحدت الوجودی تعلیمات سے کتنی قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ اس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ذہنی ارتقا کے اس مرحلے میں اقبال، نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور فارسی کے عظیم صوفی شاعر خواجہ حافظ شیرازی کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی اور اسی زمانے میں انھوں نے وجودی فلسفے پر اپنے سیاسی تصورات کی اساس رکھی۔ چنانچہ انھوں نے ہندی قومیت کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔ لیکن یہ بھی محض ایک عارضی کیفیت تھی۔

سہ سالہ قیامِ یورپ نے اقبال کے ذہن کی کایا پلٹ دی۔ انھوں نے وحدت الوجود کو ایک غیر تسلی بخش فلسفے کی حیثیت سے مسترد کر دیا اور وحدتِ ملی کا اصول ان کے خیالات کا محور بن گیا۔ بعد میں جب مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں قومیت کی تحریک پھیلی تو اقبال برعظیم ہند میں مسلم قومیت کے اولین مبلغ ہو گئے اور اپنی وفات (۱۹۳۸ء) تک اس نصب العین کی پُرجوش حمایت کرتے رہے۔ مسلم قومیت کی تحریک دو حصوں میں منقسم ہو گئی اور بالآخر اسی کے نتیجے میں مسلم اکثریت کے علاقے، ایک اسلامی مملکت کی صورت میں ہندوستان سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں اقبال نے ایک خط لکھا جو ان کے فکری انقلاب کی عکاسی کرتا ہے:

> ''میں خود بھی یہ رائے رکھتا تھا کہ اس ملک (ہند) میں مذہبی اختلافات کا خاتمہ ہو جانا چاہیے، اور اپنی نجی زندگی میں اسی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ لیکن اب میرا خیال یہ ہے کہ ہندو اور مسلم اقوام کے لیے اپنے اپنے جداگانہ قومی وجود کا تحفظ ہی مناسب ہے۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا تصور ایک حسین نصب العین ضرور ہے اور اس میں شاعرانہ تخیل کے لیے بڑی کشش ہے لیکن دونوں قوموں کے موجودہ حالات اور غیر شعوری رجحانات کے پیشِ نظر، یہ تصور عملاً ناممکن معلوم ہوتا ہے''۔ (۱)

اگر اقبال قیامِ پاکستان تک زندہ رہتے (جو ان کے تجریدی اور مبہم سیاسی تصور کی تشکیل ہے) تو یقیناً ان کا ذہنی ارتقا ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا ہوتا اور وہ اس نظریے کی بنیاد رکھتے جسے پاکستانی قومیت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی وفات اس وقت ہوئی جب اسلامیانِ ہند انگریزوں سے آزادی اور ہندوؤں سے نجات حاصل کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برعظیم ہند میں علاقائی یا وطنی قومیت کی حمایت کا مطلب یہ ہوتا کہ مسلم اقلیت جداگانہ سیاسی وجود

۱۔ سفینہ حیات از غلام قادر فرخ، صفحہ ۲۴

کو فنا کر کے اکثریتی فرقے میں مدغم ہو جائے۔ لہٰذا اقبال نے علاقائی قومیت اور وطنیت کی ترقی کو جائز قرار دیا۔ اس بارے میں خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر قومیت کے معنٰی اپنے وطن سے محبت کرنے اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمان کے لیے جزوِ ایمان ہے۔ قومیت، اسلام سے اس وقت متصادم ہوتی ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے؛ اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام محض شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر مسلم ممالک میں قومیت کبھی ایک مسئلے کی صورت اختیار نہ کرے گی۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں، مثلاً یہودی، عیسائی اور زرتشتی، اسلامی قانون کی رُو سے یا تو اہلِ کتاب ہیں یا اہلِ کتاب سے مشابہ ہیں جن سے آزادانہ معاشرتی تعلقات، حتیٰ کہ ازدواجی رشتے بھی، شرعاً جائز ہیں۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کو صرف ان ممالک میں درپیش ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیں۔ مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان کی یہ کوشش حق بجانب ہوگی کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے انھیں حقِ خود اختیاری حاصل ہو۔ یہ دونوں صورتیں اسلام کے عین مطابق ہیں''۔ (۱)

۱۹۰۸ء میں جب وہ یورپ سے واپس آئے (۲) تو مشرقِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی حالت بہت غیر محفوظ تھی۔ یورپ کی استعماری طاقتیں یا تو مسلم ممالک پر معاشی دباؤ ڈال رہی تھیں یا ان پر یکے بعد دیگرے اپنا قبضہ جما رہی

۱۔ اسلام اینڈ احمد ازم، صفحہ ۴۳، ۴۴

۲۔ اقبال ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء کو ہندوستان سے یورپ کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۵ جولائی ۱۹۰۸ء کو واپس ہندوستان لوٹے۔

تھیں۔ اس طرح سارے مشرقِ وسطیٰ میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ یورپی استعمار کی توسیع پسندانہ پالیسی کے نتیجے میں ایک جارحانہ و متشددانہ قسم کی مسلم قومیت نشوونما پا رہی تھی جس نے تمام عالم اسلام میں جذبہ حبُ الوطنی کی لہر دوڑا دی اور مشرقِ وسطیٰ میں ہر جگہ جنگِ آزادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، سرزمینِ ہند میں مسلمانوں پر سیاسی سرگرمیوں کا دروازہ بند تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت تمام تر طبقہ اعلیٰ کے ان افراد کے ہاتھ میں تھی جو انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ یہ مسلم قائدین محض اپنے مفادات کے تحفظ میں دلچسپی رکھتے تھے اور عالم اسلام کے مصائب و مشکلات سے مطلق بے نیاز تھے۔

اگرچہ برعظیم ہند کے مسلم عوام کے دلوں میں سیاسی بے چینی ہلچل مچا رہی تھی لیکن اس وقت صحیح قیادت موجود نہ تھی جو اس بے چینی کا رخ مؤثر و منظم تحریکوں کی طرف موڑ دیتی۔ بلقان سے مسلمانوں کے اخراج کے ایک سال بعد جب ایران زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور طرابلس کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوگئی تھی، اقبال کا جذبہ ملی ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' (۱) کی صورت میں بھڑک اٹھا۔ مثنوی اسرارِ خودی (۲)، رموزِ بے خودی (۳) اور دیگر انقلابی و تخلیقی شاہکاروں کا ایک سلسلہ تیزی سے چل نکلا۔ اس طرح اقبال کی آواز رفتہ رفتہ مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونکنے اور ان کی منزل کا رخ متعین کرنے لگی۔

۱۔ ''جوابِ شکوہ'' ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو جنگِ بلقان کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے بیرون موچی دروازہ، لاہور میں پڑھی گئی جو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا کی زینت بنی۔

۲۔ مثنوی ''اسرارِ خودی'' ستمبر ۱۹۱۵ء میں پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوئی۔ کتابت مشہور کاتب منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے کی اور اقبال کے دوست حکیم فقیر محمد چشتی نے اسے چھپوایا۔

۳۔ مثنوی ''رموزِ بے خودی'' اپریل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔

یوں تو اقبال پر جتنا لکھا جا چکا ہے، کسی اور مسلم شاعر کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، تاہم اب تک ایسا مواد دستیاب نہیں جو بحیثیتِ انسان، شاعر کی ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیوں، ماحول کے مرگ آسا جمود کے خلاف اس کے حیات بخش ردعمل اور اپنے ماحول سے اس کی گہری وابستگی کی آئینہ داری کرتا ہو۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسلام کے درخشاں ماضی سے ایک ولولہ تازہ حاصل کیا۔ وہ کسی طرح بھی موہوم خوابوں اور خیالوں کے رسیا یا ایک ماضی پرست رومانی شاعر نہیں تھے۔ بلکہ ہمیشہ ایک حقیقت پسند اور باعمل انسان کی حیثیت سے، عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھنے اور ایک مخصوص معاشرے میں اپنے تصورات کی مؤثر عملی تشکیل کو اپنا مطمحِ نظر بنائے رہے۔

اس بیاض میں ان اہم ترین تصورات و خیالات کے ابتدائی نقوش بھی ہیں جو بعد کے شاعرانہ کلام اور فلسفیانہ تصانیف میں بہ کمال اہتمام وآب وتاب پیش کیے گئے۔ یہاں ان کے نظریہ تاریخ کے بعض پہلو بھی مشاہدے میں آئیں گے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ کسی قوم کے روحانی اور فلسفیانہ تصورات، بیش تر اس کے سیاسی ماحول کے ترجمان ہوتے ہیں۔ان کا خیال یہ بھی تھا کہ موزوں ومناسب سیاسی نظام کا نفاذ کسی قوم کے کردار کے نشوونما کے لیے لازمی ہے۔ تاریخ میں ملتِ اسلامیہ کے مخصوص ومنفرد مقصد پر ان کا ایمان اور قومی کردار کی تعمیر کے لیے موزوں نظامِ حکومت کی اہمیت کا احساس۔ یہ دو باتیں مستقبل میں برعظیم ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر ان کے شدید اصرار کی بنیاد ہیں۔ وہ اس نوٹ بک میں لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں 'حکومت' چاہے کسی بھی قسم کی ہو،وہ قومی کردار کے متعین کرنے والے عوامل میں سے ہے۔سیاسی قوت کا کھونا، قومی کردار کی تباہی کے مترادف ہے۔اپنی سیاسی ناکامی کے ساتھ ہی ہندوستان

کے مسلمان بڑی تیزی سے اخلاقیات کے معیار سے بھی گر گئے ۔ دنیا کی تمام مسلم اقوام میں' کردار کے لحاظ سے ان کا مقام شاید سب سے کم تر ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اپنی عظمتِ رفتہ پر ماتم کروں کیونکہ ان عوامل کے بارے میں جو بالآخر اقوام کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں' میں اپنے تقدیر پر مائل ہونے کا اعتراف کرتا ہوں۔سیاسی قوت کی حیثیت سے شاید ہماری ضرورت باقی نہیں رہی۔پھر بھی مجھے یقین ہے کہ خدا کی وحدانیت کی شہادت کی وجہ سے ہمارا وجود اب بھی دنیا کے لیے ناگزیر ہے''۔ (۱)

اقبال کے نزدیک زندگی جہدِ پیہم کا نام ہے ۔لہٰذا ان کی رائے میں تعلیم کا مقصد محض ذہنی برتری کی تربیت کے بجائے کشمکشِ حیات کی تیاری ہونا چاہیے۔ وہ اکثر قوت کی ضرورت اور قوی انسان کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی عمل میں مصروف گنہگار بے حس پاکبازوں سے بہتر ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا زوال جزواً اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ غلامانہ اطاعت اور عجز وانکسار جیسی منفی اور انفعالی نیکیوں کے خوگر ہیں۔

اقبال کے پیغامِ قوت پر بعض مغربی مصنّفین نے اکثر نکتہ چینی کی ہے اور ان پر الزام لگایا ہے کہ وہ فسطائی رجحانات کے حامل ہیں۔ ایسے ناقدین ایک اسلامی شاعر کے پیغام کے معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو سمجھنے میں عموماً ناکام رہتے ہیں۔ شاعر کا مقصد حصولِ قوت کے لیے مسلمانوں کو بھرپور عمل پر اکسانا ہے' کیونکہ صرف ان کا انقلاب آفریں عمل ہی انھیں سیاسی مغلوبیت اور اخلاقی پستی سے نجات دلا سکتا ہے۔

وہ مسلمانانِ ہند کی قومی معیشت کی تباہی کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ان کے افلاس کو ان کے اخلاقی انحطاط کا ایک اہم سبب قرار دیتے تھے۔اُردو نثر میں

۱۔خیال نمبر۱۳ ''حکومت کی اقسام'' صفحہ ۴۷

اپنی اولین مطبوعہ کتاب ''علم الاقتصاد''[1] میں، جو سفرِ یورپ سے پہلے کی تصنیف ہے، انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ملک میں پھیلی ہوئی ہولناک غربت کی وجہ سے اہلِ ہند کے لیے معاشیات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ان کا قول ہے کہ جو قومیں اپنی معاشرتی و معاشی حالت کو سدھارنے کی فکر نہیں کرتیں ان کا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال پر جو کتابیں اب تک لکھی گئیں، وہ عوام کو ان کے تصورات سے روشناس کرانے میں بالعموم ناکارہ رہ گئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد سے اب تک، گزشتہ بیس برس میں اقبالیات کے موضوع پر بیش تر تحریریں کیوں سطحی اور ادنیٰ درجے کی ہیں؟ اس کا ایک سبب یہ نظر آتا ہے کہ اقبال کے جستہ جستہ اشعار جا و بے جا پیش کرنے یا پوری طرح سمجھے بغیر کہ انھوں نے فی الحقیقت کیا کہا اور کس مفہوم میں کہا (یا جو کچھ کہا اور جس مفہوم میں کہا اس کا پس منظر کیا تھا)، ان کے افکار و اقوال پر گفتگو کرنے کا رجحان پاکستان میں رو بہ ترقی ہے۔ اس بیاض میں ایک جگہ ملٹن کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے اس کے بارے میں والٹیئر (مشہور فرانسیسی طنز نگار) کا ایک قول نقل کیا ہے۔ (خیال نمبر ۴۹) والٹیئر نے کہا تھا کہ ملٹن کی شہرت برابر بڑھتی جائے گی کیونکہ اسے کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ والٹیئر کا یہ قول پاکستان میں اقبال پر بھی اسی طرح صادق آتا ہے۔

اس کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام سے ایک سیاسی معنویت و اہمیت وابستہ ہے۔ بائیں بازو کے پاکستانی ''دانشور'' ہمیشہ اقبال کو اپنے

۱۔ ''علم الاقتصاد'' ۱۹۰۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب پیسہ اخبار کے خادم التعلیم سٹیم پریس، لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز منیجر کے زیرِ اہتمام چھپی اور ڈبلیو۔ بیل، محکمہ تعلیم پنجاب کے نام سے منسوب ہے جو تھامس آرنلڈ کی گورنمنٹ کالج میں آمد سے قبل اقبال کے فلسفہ کے استاد تھے۔

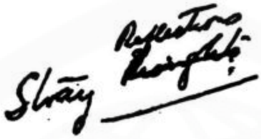
مقاصد کی راہ میں ایک سنگِ گراں سمجھتے رہے ہیں اور مسلم عوام میں اپنے نظریات کی اشاعت و مقبولیت کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے اس مضبوط دفاعی حصار کو ڈھا دیا جائے۔ لہٰذا جب کبھی موقع ملتا ہے بائیں بازو کے یہ "دانشور" اقبال کو ان کے بلند مقام سے نیچے گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری جانب دائیں بازو کے پاکستانی فضلا کا طبقہ، جو اقبال کی عقیدت مندی کا دم بھرتا ہے، ان کے بارے میں اپنے مخصوص توہمات و مفروضات میں مبتلا ہے۔ اس طبقے کے افراد یقیناً اسلام کے علمبردار ہیں لیکن اقبال کو بائیں بازو والوں کی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے (اور جو لوگ مذہبی یا فرقہ وارانہ یا صوبائی اور علاقائی تعصبات کی بناپر اقبال کی تنقیص و تحریف کرتے تھے، ان کے حملوں سے بچائے) کی دھن میں وہ اس شاعرِ اسلام کو اپنے پسندیدہ خیالات کا جامہ پہناتے ہیں۔ نتیجتاً اقبال کو ایک قدامت پرست اور رجعت پسند کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور فضلا کے اس گروہ کی تحریریں فکرِ اقبال کی حیات افزا، حرکی اور ترقی پسندانہ خصوصیات کو گرفت میں لانے یا ان کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں۔

اس کا ایک اور سبب یہ ہے کہ ہمارے بیش تر مصنّفین ازمنۂ وسطیٰ کی ابہام پسندی اور تجرید پرستی کا شکار ہیں جس سے ان کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے جو اصلی اور تخلیقی تحقیق کی ترقی میں حائل ہے۔ ایسے مصنّفین محض غیر حرکی تحقیق کی طرف مائل ہیں اور زندہ دل، بت شکن اقبال کو ایک خنک و مکروہ بت کے روپ میں پیش کرنا ہی ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان حضرات کی رائے میں اقبال کی عظمت کا انحصار اس پر نہیں کہ ان کے اعلیٰ مقاصد تکمیل پذیر ہوں بلکہ اس پر ہے کہ ان کا کلام فہم و ادراک سے پرے ہے۔ اقبال کے بارے میں ایسی تصانیف کا اثر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں ایک مردہ تتلی کی طرح دیوار پر چسپاں کر دیا جائے، بجائے اس کے کہ ان کے تصورات سے عوام کو روشناس کرایا

جائے تا کہ اقبال ہمارے ذہنوں میں ایک زندہ قوت بن کر ثقافتی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کی تعمیرِ نو کی مہم میں ہماری حوصلہ افزائی، رہنمائی اور تقویت کا باعث ہوں۔

اقبال کے یہ مدّاح و مفسّر، ان کے مقاصد کو موجودہ مسائل سے اس طرح مربوط کرنے میں عموماً ناکام رہتے ہیں، جس طرح اقبال نے اسلام کے ماضی کے حوالے سے اپنے عہد کے مسائل کو حل کیا تھا۔ اقبال کی تعلیمات کی روح، مستقبل کے ایسے اسلامی معاشرے کا تصور ہے جو افراد کی بھرپور ترقی کا ضامن ہوگا تا کہ وہ تخلیقی عمل میں خدا کے معاون و ہم کار کا منصب حاصل کر سکیں۔ لہٰذا وہ برعظیم ہند میں پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اسلامی سوشلزم کے قیام کا مربوط و متناسب مطالبہ پیش کیا۔ اقبال کی صحیح قدر شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے معاشی و معاشرتی نظام کو ترقی دی جائے جس کے ذریعے ان کے تصور کی عملی تعبیر و تکمیل میں سہولت پیدا ہو۔ اقبال عالمانہ قیل و قال کے بجائے جوشِ کردار کے حامی تھے۔ بدقسمتی سے افکارِ اقبال کو مقبولِ عام بنانے کی سعیِ بسیار کے باوجود اقبال ہنوز گوہرِ خاک افتادہ کی مانند ہے۔

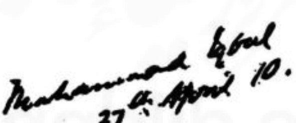
یہ بیاض اقبال کے اُن مسوّدات میں سے ہے جن میں مختلف خطوط اور غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔ میری خواہش ہے کہ رفتہ رفتہ ان مسودات کو مرتب کر کے شائع کروں۔ مطبوعات کے سلسلے کا آغاز اس بیاض سے ہو رہا ہے۔ اقبال نے یہ مختصر خیالات جس صورت سے ترتیب دیے تھے بعینہٖ اسی طرح رہنے دیے گئے ہیں۔ اصل عبارات کے شروع میں عنوان اور عددِ شمار کے اضافے کے سوا متن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ اضافے اس غرض سے کیے گئے کہ ہم ان خیالات کے تنوع کا کچھ اندازہ لگا سکیں جو ذہنی تشکیل و ارتقا کے اس دور میں شاعر کے دل و دماغ پر چھائے رہتے تھے۔



Stray Reflections

منتشر خیالاتِ اقبال

Muhammad Iqbal



۱۔فن

فن ایک متبرک جھوٹ ہے۔

۲۔انکشاف

جب ہم کسی عظیم ذہن سے رابطہ کرتے ہیں تو ہماری روح خود اپنا انکشاف کرتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی غیر محدودیت سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہوگئی۔

۱۔گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ۷۹)

۳۔انسانی عقل

انسانی عقل، فطرت کی جانب سے خود انتقادی کی ایک کوشش ہے۔

۴۔خیرات کی معاشیات

مخیّر انسان درحقیقت غیر مخیّر کی مدد کرتا ہے نہ کہ مفلس کی۔ کیونکہ جو کچھ کسی غریب کو دیا جاتا ہے عملاً اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو غریبوں کو کچھ نہیں دیتے۔ غیر مخیّر انسان اس طرح فیض رسانی سے لاتعلق رہتا ہے اور خیرات دینے والا اس کا بدلہ چکاتا ہے۔ یہ خیرات کی معاشیات ہے۔

۵۔خدا کا وجود

میرے دوست اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں'' کیا تم خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہو؟'' میرا خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں کہ جواب دینے سے پہلے اُن اصطلاحات کے معانی جانوں جو اس سوال میں استعمال ہوئی ہیں۔ اگر وہ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مجھ پر واضح کریں کہ ''یقین''، ''وجود'' اور ''خدا''۔ (خاص طور پر آخری دو) سے ان کی کیا مراد ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں میں ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتا اور جب کبھی میں اُن پر جرح کرتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح نہیں سمجھتے۔

٦۔ایک مکالمہ

دل:''یقیناً یہ صحیح ہے کہ خدا وجود رکھتا ہے''۔

عقل:''لیکن عزیز من!'وجود' میرے مقولات میں سے ہے اور تمہیں اس کے استعمال کا حق نہیں''۔

دل:''یہ اور بھی بہتر ہے' میرے ارسطو!''۔

ا۔ارسطو (دیکھیے خیال نمبر۲۹''ارسطو''صفحہ ٦١)

۷۔جھوٹی شان کی تسکین

جھوٹی شان کی تسکین میں ہمارے لیے ایک معاشی قدر ہے۔ مجھے ہسپتال اسسٹنٹ کے بجائے سب اسسٹنٹ سرجن کہیں تو بھی میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا چاہے آپ میری تنخواہ میں اضافہ نہ کریں۔

۸۔ظالم نفسیات

ظالم نفسیات کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔آپ اپنی مہم جوئی میں ناکام ہوئے اور اب آپ کی خواہش ہے کہ گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں قسمت آزمائیں ۔ایسا نہیں ہے کہ آپ کی ناکامی نے آپ کی حوصلہ مندی میں ایک تازہ تحریک پیدا کر دی ہے۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے چہرے کو ان لوگوں سے چھپانا چاہتے ہو جو آپ کی ناکامی کے عینی شاہد ہیں۔

۹۔یقین کی طاقت

یقین عظیم طاقت ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ایک نظریے پر کسی دوسرے کو یقین آ گیا ہے تو خود میرے یقین کی صداقت بے انتہا بڑھ جاتی ہے۔

۱۰۔ اسلام کا تصورِ خدا

عیسائیت نے خدا کو صفت محبت سے موصوف کیا ہے جبکہ اسلام نے قادرِ مطلق کا تصور پیش کیا ہے۔ ہم ان دونوں تصورات کے درمیان کیسے فیصلہ کریں؟ میرے خیال میں نوعِ انسانی اور کائنات کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ان میں سے کون سا تصور زیادہ صحیح ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تاریخ میں محبت سے زیادہ خدا کی قدرت کا ظہور ہے۔ میں خدا کی محبت کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تاریخی تجربے کی بنا پر، خدا کو قادرِ مطلق کہنا زیادہ مناسب ہے۔

۱۱۔ ہیگل کا نظامِ فلسفہ

ہیگل کا نظامِ فلسفہ نثر میں رزمیہ نظم ہے۔

۱۔ جان ولیم فریڈرک ہیگل: (۲۷ اگست ۱۷۷۰ء۔ ۱۴ نومبر ۱۸۳۱ء) مشہور فلسفی اور جرمن تصوریت کی ایک اہم شخصیت۔ اس نے اپنی مشہور کتاب ''لوجک (Logic)'' کی پہلی جلد ۱۸۱۲ء میں شائع کی۔ وہ ۱۸۱۶ء میں ہائیڈل برگ میں فلسفے کا پروفیسر مقرر ہوا۔ لیکن دو سال بعد اس نے برلن میں پروفیسری قبول کی اور آخر دم تک یہیں مقیم رہا۔ ہیگل کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حقیقت کا ایک نظام مدوّن کیا جائے اور تمام کثرت کو کسی اصولِ واحد سے بطور ایک نظامِ ارتقا کے منتزع کیا جائے۔ اس کے نقطۂ نگاہ سے وہ اصولِ واحد تصورِ مطلق ہے اسی کے ظہور سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ اقبال نے بھی اضداد کی کشمکش سے ارتقا کا اصول ہیگل کے فلسفہ سے اخذ کیا ہے۔ ہیگل سے مستفید ہونے کے باوجود وہ اس سے مرعوب نہیں ہوئے۔ یہ درج ذیل اشعار اس کا ثبوت ہیں:

حکمتش معقول و با محسوس در خلوت نرفت
گرچہ بکرِ فکرِ او پیرایہ پوشیدہ چوں عروس
طائرِ عقلِ فلک پروازِ او دانی کہ چیست؟
ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس
(پیامِ مشرق)

......

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
(ضربِ کلیم)

۱۲۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء

۱۵ مئی ۱۹۱۰ء: کل صبح کے تقریباً چار بجے، میں نے کرۂ ارض کا شاندار زائر جو ہیلی کا دمدار ستارہ کہلاتا ہے، دیکھا۔ لامتناہی خلا کا یہ پُرشکوہ شناور چھتر سال میں ایک دفعہ ہمارے آسمانوں پر نمودار ہوتا ہے۔ اب میں اپنے پوتوں/نواسوں کی نگاہوں سے دوبارہ اس کا نظارہ کرسکوں گا۔ میرے تخیل کی کیفیت بالکل انوکھی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اپنی ناقابلِ بیان وسعت کے ساتھ میرے تنگ نائے وجود میں سما چکی تھی۔ تاہم اس خیال نے کہ میں اس سیلانی کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا، مجھے اپنی ہیچ مدانی کی تلخ حقیقت کا احساس دلایا۔ اس لمحے میری تمام اولوالعزمی ماند پڑ گئی۔

ا۔ ہیلی کا دُمدار ستارہ: ہر چھتر سے چھتر برس بعد نمودار ہوتا ہے جو انسانی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ نظامِ شمسی میں اس کا مشاہدہ کم ازکم ۲۴۰ قبل مسیح سے ماہرین فلکیات کرتے آرہے ہیں۔ جبکہ اس کے شواہد چینی اور بابل کی تہذیبوں کے علاوہ قرونِ وسطیٰ کی یورپی وقائع نگاری میں ملتے ہیں۔ دُمدار ستارے کی مدت اور اس کے مدار کا تعین پہلی دفعہ ایک انگریز ماہرِ فلکیات ایڈمنڈ ہیلی نے ۱۷۰۵ء میں کیا جس کے نام پر اس دُمدار ستارے کا نام ہے۔ اس کے بعد سے ہیلی کے دُمدار ستارے کے نمودار ہونے کی تاریخیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۳ مارچ ۱۷۵۹ء

۱۶ نومبر ۱۸۳۵ء

۲۰ اپریل ۱۹۱۰ء

۹ فروری ۱۹۸۶ء

۱۹۱۰ء میں نمودار ہونے والے دُمدار ستارے کی تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے جس روز یہ عبارت تحریر کی اسی روز کی تاریخ لکھی جبکہ یہ واقعہ گزشتہ کل کی بجائے گزشتہ دنوں کا ہوسکتا ہے اور جب یہ بیاض لکھنی شروع کی ہو تو ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء کی تاریخ لکھ کر گزشتہ ایام میں پیش آنے والے واقعے کو قلمبند کیا ہو۔ اسی طرح کا ایک اہم ثبوت ہمیں جرمنی میں مقالہ جمع کرواتے ہوئے ان کے اپنے ہی ہاتھ سے لکھی ہوئی تاریخِ پیدائش کے موقعے پر بھی ملتا ہے۔

۱۳۔حکومت کی اقسام

الیگزینڈر پوپ کہتا ہے ''حکومت کی اقسام کے متعلق لڑنا جھگڑنا بے وقوفی ہے''۔ میں اس سیاسی فلسفے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں حکومت، چاہے کسی بھی قسم کی ہو وہ قومی کردار کو متعین کرنے والے عوامل میں سے ہے۔سیاسی قوت کا کھونا، قومی کردار کی تباہی کے مترادف ہے۔اپنی سیاسی ناکامی کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمان بڑی تیزی سے اخلاقیات کے معیار سے بھی گر گئے ۔ دنیا کی تمام مسلم اقوام میں، کردار کے لحاظ سے، ان کا مقام شاید سب سے کم تر ہے۔میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اپنی عظمتِ رفتہ پر ماتم کروں کیونکہ ان عوامل کے بارے میں، جو بالآخر اقوام کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں، میں اپنے تقدیر پر مائل ہونے کا اعتراف کرتا ہوں۔ سیاسی قوت کی حیثیت سے شاید ہماری ضرورت باقی نہیں رہی۔پھر بھی مجھے یقین ہے کہ خدا کی وحدانیت کی شہادت کی وجہ سے ہمارا وجود اب بھی دنیا کے لیے ناگزیر ہے۔اقوامِ عالم میں ہماری اہمیت خالصتاً متعلق بہ شہادت ہے۔

۱۔الیگزینڈر پوپ: (۲۱ مئی ۱۶۸۸ء۔۳۰ مئی ۱۷۴۴ء) انگریز شاعر، جس کا کلام سنجیدہ خیالات اور اقوال کا حامل ہے۔اس کی وجہ شہرت ہومر کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔

۲۔انہی خیالات کو تحریر کرتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں انجمن شبابِ اسلام کے اجلاس میں اقبال نے ایک نظم بہ عنوان ''ترانہ ملی'' پڑھی جس کا یہ شعر اس عبارت کی توضیح بیان کرتا ہے:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
(بانگِ درا)

۱۴۔ شاعری اور منطقی صداقت

شاعری میں منطقی صداقت کی تلاش لاحاصل ہے۔ تخیل کا مثالی تصور حسن ہے، نہ کہ صداقت۔ کسی شاعر کی عظمت کے ثبوت میں وہ نمونے اس کے کلام سے پیش نہ کریں جو آپ کی رائے میں سائنسی صداقت کے ترجمان ہیں۔

۱۵۔ شخصیت کی ابدی زندگی

شخصیت کی ابدی زندگی کوئی کیفیت نہیں، یہ ایک عمل ہے۔ میرے خیال میں روح اور جسم کی تفریق نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کئی مذہبی اصولوں کی بنیاد اس غلط تفریق پر ہے۔ انسان حقیقتاً ایک توانائی، ایک قوت یا قوتوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے عناصر کی ترتیب میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ ان قوتوں کی ایک خاص ترکیب کا نام شخصیت ہے۔ یہاں مجھے اس امر سے کوئی سروکار نہیں کہ آیا یہ ترتیب محض اتفاقی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ فطرت کے حقائق میں سے ایک حقیقت ہے اور جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ آیا قوتوں کی یہ ترتیب، جو ہمیں عزیز ہے، اسی طرح جاری رہ سکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ قوتیں کام کو اُسی رخ پر جاری رکھیں گی جس طرح یہ زندہ، صحت مند شخصیت میں عمل پیرا ہیں؟ میرے خیال میں ایسا ممکن ہے۔ انسانی شخصیت کو ایک دائرہ فرض کیجئے یا یوں کہیے کہ ان قوتوں کی خاص ترتیب کے نتیجے میں ایک واضح دائرہ وجود میں آتا ہے اور ان کی ترتیب میں

خلل آنے سے وہ دائرہ مٹ جاتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس دائرے کے تسلسل کو ہم کیسے محفوظ بنا سکتے ہیں؟ دیکھنے میں اس کی صورت ایسی ہے کہ ہم اپنے آپ کو کچھ اس طرح تقویت پہنچائیں کہ اس کے قوائے ترکیبی کو اپنے مقررہ معمول کے مطابق عمل کرنے میں مدد ملے۔ آپ کو سرگرمی کے یہ سارے طریقے چھوڑ دینے چاہئیں جو شخصیت کو تحلیل کرنے پر مائل ہوں۔ مثال کے طور پر عاجزی، قناعت، غلامانہ تابع داری، انسانی عمل کے وہ انداز جو کہ غلط فہمی سے نیکی سے منسوب ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات اور قوت پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں جو کہ شخصیت کو مستحکم کرتی ہیں۔

شخصیت انسان کا سب سے پسندیدہ سرمایہ ہے؛ لہٰذا اسی کو خیرِ مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ وہ اچھا ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے جبکہ وہ بُرا ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کرنے کے دَر پے ہو۔ اگر ہم وہ طرزِ زندگی اختیار کریں جس سے شخصیت کو تقویت ملے تو حقیقتاً ہم موت کے خلاف لڑیں گے' ایک صدمے کے خلاف جس سے ہماری شخصیت کی اندرونی قوتوں کی ترتیب منسوخ ہو جاتی ہے۔ شخصیت کی ابدی زندگی ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ شخصیت کی ابدی زندگی کے تحفظ کے لیے جدوجہد درکار ہے۔ جو خیال یہاں پیش کیا گیا دور رَس نتائج کا حامل ہے۔ کاش اس نقطۂ نظر سے اسلام' بدھ مت اور عیسائیت کی تقابلی حیثیت پر بحث کرنے کا موقع میسر آتا' لیکن بدقسمتی سے اس کی تفصیلات کا جائزہ لینے کی مجھے فرصت نہیں۔

۱۶۔تاریخ

تاریخ اطلاقی اخلاقیات کی ایک قسم ہے۔اگر اخلاقیات ایک تجرباتی علم ہے جیسا کہ دوسرے علوم ہیں تو اسے انسانی تجربے کے علم پر مبنی ہونا چاہیے۔اس رائے کے عام اعلان سے ان لوگوں کے احساسات کو صدمہ پہنچے گا جو اخلاقیات میں روایتی تصورات کی تقلید کرتے ہیں لیکن جن کا عام طرزِ عمل تاریخ کی تعلیمات سے ہی متعین ہوتا ہے۔

۱۷۔ مابعد الطبیعیات

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ما بعدالطبیعیات سے کچھ اکتا سا گیا ہوں۔لیکن جب کبھی میں لوگوں سے استدلال کرتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ ان کی بحث ان بیانات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں وہ بغیر تنقید کے مان لیتے ہیں۔لہٰذا میں ان بیانات کی قدر و قیمت جانچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔مسائل کی تمام عملی اشکال میں مجھے نظریت کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے مابعدالطبیعیات سے نجات ناممکن ہے۔

۱۔مجموعی طور پر اقبال کے مقالات وخطبات کا تجزیہ کیا جائے تو حسبِ ذیل نکات سامنے آتے ہیں جن سے اقبال کی مابعدالطبیعیات سے بددلی کا اندازہ ہوتا ہے:

۱) مابعدالطبیعیات کی حیثیت نظری ہے، عملی نہیں۔

۲) مابعدالطبیعیات کا انحصار فکری مفروضات پر ہے، روحانی اور باطنی تجربات و واردات پر نہیں۔

۳) مابعدالطبیعیات ظن و قیاس کا شکار رہتی ہے، محکم ایمان کی اہل نہیں۔

۴) مابعدالطبیعیات کا مقصود انسان کی منطقی فکر پر پورا اترنا ہے، انسانی احساسات وجذبات کو چھو کر گزرنا نہیں۔

۵) مابعدالطبیعیات کا اصرار انسان کی عقلی توجیہات کی تشفی کرنا ہے، اس کی روحانی توجیہات کی تسکین کرنا نہیں۔

(استقرائی استدلال اور فکرِ اقبال از خالد الماس، صفحہ ۲۵۰)

۱۸۔ تعصّب

تمام اقوام ہمیں تعصّب کا الزام دیتی ہیں۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ بلکہ میں مزید کہتا ہوں کہ ہم اپنے تعصب کا جواز پیش کرنے میں حق بجانب ہیں۔ حیاتیات کی زبان میں، تعصب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ ایک ایسا اصولِ فردیت ہے جو فردِ واحد کی بجائے، ایک جماعت میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کی کم و بیش تمام اقسام متعصب ہیں اور اگر انہیں اپنے اجتماعی وجود کا تحفظ درکار ہے تو انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ امر واقع یہ ہے کہ تمام اقوام متعصّب ہیں۔ کسی انگریز کے مذہب پر تنقید کریں تو وہ غیر متحرک ہی رہے گا لیکن اس کی تہذیب، اس کے وطن یا اس کی قوم کے طرزِ عمل میں کسی معاملے پر تنقید کریں تو اس کا خلقی تعصب آپ پر واضح ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی قومیت مذہب پر منحصر نہیں ہوتی، بلکہ یہ جغرافیائی بنیاد پر یعنی اس کے ملک پر منحصر ہے۔ اس کا متعصّبانہ رویہ تب بیدار ہوتا ہے جب آپ اس کے ملک پر تنقید کرتے ہیں۔ تاہم ہماری حیثیت بنیادی طور پر قدرے مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک خالص تصور ہے۔ یہ مادیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ کائنات کے ایک خاص نظریے کے متعلق ہمارا نقطۂ اتحاد ذہنی ہم آہنگی کی ایک قسم ہے۔ اگر مذہب پر تنقید ہمارے تعصب کو اجاگر کرتی ہے تو میرے خیال میں ہم اپنے تعصبی رویے پر حق بجانب ہیں جیسے وہ انگریز جس کی تہذیب پر ملامت کی جاتی ہے۔ دونوں معاملات میں احساس کی نوعیت ایک جیسی ہے اگرچہ اس کا تعلق مختلف مقاصد سے ہے۔ تعصب مذہب کے لیے وطن پرستی ہے۔ وطن پرستی ملک کے لیے تعصب ہے۔

۱۹۔وطن پرستی

اسلام بت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر ظاہر ہوا۔ وطن پرستی کیا ہے، بت پرستی کی ایک لطیف قسم' ایک مادی شے کو معبود ٹھہرانا۔ مختلف اقوام کے ملی نغمے میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وطن پرستی ایک مادی شے کو معبود ٹھہرانا ہے۔ اسلام کسی بھی صورت میں بت پرستی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا ازلی مقصد ہے کہ بت پرستی کی تمام اقسام کے خلاف احتجاج کریں۔ اسلام نے جس چیز کو مٹایا تھا وہ سیاسی گروہ کی ساخت کا اہم اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ حقیقت کہ پیغمبر کا قیام اور وصال' جو جائے پیدائش پر نہیں ہوا اتفاقاً اسی حقیقت کی طرف ایک عرفانی اشارہ ہے۔

ا۔ پیغمبر سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی۔ ہجرت کے بعد اُن کا قیام اور وصال مدینہ منورہ میں ہوا۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''وطنیت'' میں بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے:

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(بانگِ درا)

۲۰۔انصاف

انصاف ایک بیش بہا خزانہ ہے لیکن ہمیں رحم کی مداخلت کے خلاف اس کا تحفظ کرنا چاہیے۔

۲۱۔مسلم اتحاد

جیسا کہ میں پہلے اسلام اور وطن پرستی کے بارے میں کہہ چکا ہوں؛ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہماری ملی یگانگت کی گرفت مذہبی اصول پر منحصر ہوتی ہے۔جس لمحے یہ گرفت ڈھیلی ہوگی ہم کہیں کے نہیں رہیں گے اور غالباً ہمارا وہی انجام ہوگا جو یہود کا ہوا۔ اس گرفت کی مضبوطی کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کسی بھی معاشرے میں مذہب کا اصولی محافظ کون ہے؟ جواب ہے :عورت۔ مسلمان عورت کو صحیح مذہبی تعلیم حاصل ہونی چاہیے کیونکہ عملاً وہی معاشرے کی معمار ہیں۔میں ایک مطلق نظامِ تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم' دوسری اشیا کی طرح' معاشرے کی ضروریات سے متعین ہوتی ہے۔ ہمارے مقصد کے پیشِ نظر' مذہبی تعلیم مسلمان عورت کے لیے کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں نسوانیت اور مسلمانیت سے محروم کر دینے کا رجحان پایا جائے' احتیاطاً نظامِ تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں مگر ہمارے ماہرینِ تعلیم ابھی تک اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں۔ وہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوئے کہ اپنی بچیوں کے لیے تعلیم کا نصاب مقرر کر سکیں۔شاید وہ مغربی تصورات کی کشش سے اس قدر چندھیا چکے ہیں کہ ایک طرف اسلام جو خالصتاً ایک ذہنی تصور یعنی ''مذہب'' کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کرتا

ہے اور دوسری طرف' مغربیت' جس میں قومیت کا تصور ایک مادی شے یعنی ''ملک'' سے عبارت ہے' میں فرق نہیں سمجھ سکے۔

ا۔اسی خیال کو علامہ اقبال نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت!

(ضربِ کلیم)

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِنظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

(بانگِ درا)

۲۲۔جرمن قوم

فطرت کی جز رسی کے باعث ہر قوم کے لیے ایک مقصد مختص کیا گیا ہے۔ جرمن قوم کا مقصد انسانی علم کو منظم کرنا ہے۔لیکن حال ہی میں انھوں نے ایک تجارتی مہم کا آغاز کیا ہے جس میں وہ ایک سلطنت تو پا سکتے ہیں لیکن ایک بلند تر مقصد کے بدلے میں تجارتی لگن کی یہ محویت انہیں مہنگی پڑے گی۔

۲۳۔ دورِ جدید کا ہندو

یہ انتہائی دلچسپی کی بات ہے کہ کسی قوم میں ایک نئے نصب العین کی آفرینش اور نشو و نما کا مشاہدہ کیا جائے۔ یہ نصب العین نیا ولولہ اور جوش پیدا کرتا ہے اور شدت کے ساتھ اس قوم کی تمام توانائیوں کو ایک مشترکہ مرکز پر مجتمع کر دیتا ہے۔ دورِ جدید کا ہندو اس صورتِ حال کا مظہر ہے۔ میرے لیے اس کا رویہ سیاسی مطالعے سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی آزادی کا مطمح نظر جو اس کے لیے بالکل ایک نیا تجربہ رکھتا ہے اس کی روح پر مکمل طور پر قابض ہو گیا ہے جس سے اس کی روح کے متعدد دھارے اپنی حسبِ معمول آبناؤں کو چھوڑ کر میدانِ عمل کے نئے آبنائے میں کھل کر شدت کے ساتھ آگے آئے ہیں۔ اس تجربے سے گزرنے پر اسے اپنے نقصان کا اندازہ ہو گا۔ وہ اپنی کایا پلٹ کر بالکل ایک نئی قوم میں آجائے گا۔ نئی اس مفہوم میں کہ وہ اپنے آپ میں ان اخلاقی تصورات کا غلبہ نہیں پائے گا' جو اس کے اسلاف کی تھیں' جن کے پُر جلال تصوّرات' بہت سے مضطرب ذہنوں کی دوامی دل جوئی کا ذریعہ رہے ہیں۔ اقوام تصورات کا سرچشمہ ہیں' لیکن تصورات' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی اقوام کو جنم دیتے ہیں۔

۲۴۔ حق اور طاقت

فلسفہ حق کی منطق ہے' تاریخ طاقت کی منطق ہے۔ بعد الذکر منطق کے احکام میں اول الذکر منطق کے احکام سے زیادہ وضاحت ہے۔

۲۵۔افغانستان کا مستقبل

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ حائلی ریاستیں کبھی بھی اس قابل نہیں ہوئیں کہ وہ عظیم سیاسی اکائیوں کی صورت اختیار کریں۔جیسا کہ ملکِ شام جو کہ سلطنتِ روما اور سلطنتِ فارس کے درمیان ایک حائلی ریاست تھا' ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار رہا۔افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے پیش گوئی مشکل محسوس ہوتی ہے۔

۲۶۔حیات بطور شاعری پر تنقید

میتھیو آرنلڈ نے شاعری کو بطور 'حیات کی تنقید' قرار دیا ہے۔مگر یہ بات بھی یکساں طور پر درست ہے کہ حیات خود شاعری کی تنقید ہے۔

ا۔میتھیو آرنلڈ: (۲۴ دسمبر ۱۸۲۲ء۔۱۵ اپریل ۱۸۸۸ء) انگریز شاعر' ماہر تعلیم اور ثقافتی نقاد۔ اس نے شاعری' تنقید اور تعلیم کے میدانوں میں نئی راہیں متعین کیں۔

۲۷۔ یورپی عیسائیت

انسانی تخیل کے حلقے میں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بدھا اور کانٹ غالباً سب سے بڑے انقلابی تھے۔ عمل کے حلقے میں نپولین کی شخصیت بے نظیر ہے۔ میں دنیا کے انقلابیوں میں مسیح علیہ السلام کو شامل نہیں کرتا، کیونکہ جو تحریک انھوں نے شروع کی وہ جلد ہی الحادِ قبلِ مسیح میں جذب ہوگئی۔ میرے نزدیک یورپی عیسائیت سامی علم کلام کی زبان میں قدیم جاہلیت کے ایک کمزور ترجمے سے زیادہ کچھ نہیں۔

۱۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم (۲۰ اپریل ۵۷۱ء۔ ۷ مئی ۶۳۲ء) دنیا کے سب سے بڑے ہادی اور خدا کے آخری پیغمبر۔ خدا کی تمام مخلوق کے لیے رحمت۔ جن پر ایمان لانے والے مسلمان، آج دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری آپ کے عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(بانگِ درا)

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیںؔ، وہی طٰہٰؔ!
(بالِ جبریل)

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست
بتا کم موج ے از زمزمِ تست
خجل ملکِ جم از درویشی من
کہ دل در سینۂ من محرمِ تست
(ارمغانِ حجاز)

۲۔مہا تما گوتم بدھ:(۵۶۳ قبل مسیح۔۴۸۳ قبل مسیح) بدھا سے بدھ مذہب چلا۔ان کا اصلی نام 'سدھارتھ' تھا۔ذات پات کی تمیز کے سخت خلاف تھے۔انہوں نے خود شہر شہر اور بستی بستی پھر کر اپنے عقیدہ کی تبلیغ کی اور بدھ مت کو دور دور تک پھیلایا۔ برہمنوں نے جب بدھوں کو برِصغیر سے نکالا تو انہوں نے جاپان اور چین جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔

دیارِ ہند نے جس دم میری صدا نہ سنی
بسایا خطہ جاپان و ملکِ چیں میں نے
(بانگِ درا)

۳۔کانٹ (دیکھیے خیال نمبر ۶۹ ''کانٹ کا امر مطلق'' صفحہ ۹۳)

۴۔نپولین بونا پارٹ: (۱۵ اگست ۱۷۶۹ء۔۵ مئی ۱۸۲۱ء) فرانسیسی جرنیل اور سیاسی رہنما۔ جس نے یورپ میں فرانسیسی انقلاب اور اس سے منسلک جنگوں میں نمایاں شہرت حاصل کی۔ وہ ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۵ء تک فرانس کا شہنشاہ تھا۔ نپولین صرف فوجی حیثیت ہی سے بڑا آدمی نہ تھا بلکہ انتظامِ حکومت اور قانون سازی میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ اس نے ہر میدان میں فتح پائی مگر ماسکو اور واٹرلو کی ناکامیاں اس کی تباہی کا باعث بنیں۔

۵۔مسیح (دیکھیے خیال نمبر ۲۸ ''مسیح اور سپنوزا'' صفحہ ۶۰)

۲۸۔ مسیح اور سپنوزا

نسلِ یہود نے صرف دو عظیم شخصیات کو جنم دیا ہے، مسیح علیہ السلام اور سپنوزا۔ دونوں خدا کے روپ میں مجسم مانے گئے تھے۔اول الذکر بیٹے کے طور پر، موخر الذکر کائنات کے روپ میں۔سپنوزا اپنی نسل کے عظیم ترین استاد کا محض تکملہ تھا۔

ا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام: خدا کے رسول۔ حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہودیوں کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا۔مگر یہی یہودی آپ کے سخت ترین دشمن تھے۔یہی وجہ تھی کہ یہودیوں کی حکومت نے آپ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دینے کا فیصلہ کیا۔عیسائی کہتے ہیں کہ انہیں سولی دے دی گئی مگر اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ ان کے دشمنوں کو شبہے میں ڈال دیا گیا تھا اور آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں مَیں نے

(بانگِ درا)

۲۔باروش سپنوزا: (۲۴ نومبر ۱۶۳۲ء۔۲۱ فروری ۱۶۷۳ء) ولندیزی فلسفی۔جس کی نمایاں علمی قابلیت کا انکشاف اس کی موت کے بعد بھی کئی سالوں تک نہ ہو سکا۔اٹھارہویں صدی میں روشن خیالی کی بنیاد اور جدید بائبل پر تنقید نے اسے سترھویں صدی کا ایک عظیم عقلیت پسند بنا دیا۔اس نے آزادیِ فکر کی خاطر دولت وشہرت سے بے نیاز زندگی گزاری۔سپنوزا کو اپنے پیشرو ڈیکارٹ پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ ڈیکارٹ دو جواہر یعنی مادہ اور نفس کو اصل الاصول قرار دیتا ہے اور سپنوزا ایک ہی جوہر یعنی خدا کو اصل الاصول قرار دیتا ہے اور مادہ اور نفس کو اس جوہرِ اصلی کے تعینات سے تعبیر کرتا ہے۔

۲۹۔ ارسطو

میں ارسطو سے نہایت عقیدت رکھتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ میں (بیسویں صدی کا باشندہ) اسے اپنی نسل کے اسلاف سے زیادہ بہتر طور پر جانتا ہوں بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے میری قوم کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ تاہم افلاطون کے نظریہ اعیان پر اس کی تنقید میں جو ہلکی سی ناشکری نظر آتی ہے؛ وہ مجھے اس کی مکمل مدح سے روک دیتی ہے۔ میں سچائی پر مشتمل اس کی اپنے استاد کے نظریات کی تکذیب کا انکار نہیں کرتا مگر مجھے سخت نفرت ہے اس انداز سے؛ جس سے وہ ان کو پیش کرتا ہے۔

۱۔ارسطو: (۳۸۴ قبل مسیح ۔ ۳۲۲ قبل مسیح) قدیم یونان کا مشہور فلسفی اور جامع العلم شخص۔ افلاطون کا شاگرد اور سکندرِ اعظم کا استاد۔ اس کی تحریریں، طبیعیات، مابعدالطبیعیات، شاعری، تھیٹر، موسیقی، منطق، بیانات، حکومت، لسانیات، اخلاقیات، حیاتیات اور حیوانات سمیت کئی مضامین کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس نے مختلف علوم کے بنیادی اصول مرتب کیے اور تقریباً ۱۲۰ کتابیں تحریر کیں۔ ارسطو نے پہلی دفعہ مغربی فلسفہ کا ایک جامع نظام اپنی تحریروں کے ذریعے پیش کیا۔

ارسطو وہ واحد یونانی مفکر ہے جسے اقبال نے دیگر یونانی مفکرین کی نسبت بہتر پایا ہے۔ اس کی فکری پرواز نے اسے ایک خاص حد تک متاثر کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے طرزِ استدلال کا دخل ہے' اس سے اسے مایوسی رہی ہے۔ عموماً ارسطو کے فکر و استدلال کو افلاطون کے افکار کا ناقدانہ ردِعمل خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اقبال نے بھی اسے اسی تناظر میں دیکھا ہے۔

(استقرائی استدلال اور فکرِ اقبال از خالد الماس' صفحہ ۱۴۶)

۲۔ افلاطون (دیکھیے خیال نمبر ۹۷ ''افلاطون اور گوئٹے'' صفحہ ۱۰۳)

۳۔ نظریہ اعیان: افلاطون کے نزدیک دنیائے موجودات کی ہر مادی شے اپنے تصور کی نقل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شے کی غایت اس کا تصور ہی ہے کیونکہ کسی نقل کی اصل ہی اس کی غایت ہوتی ہے۔ اس نسبت سے' دنیائے موجودات کی ہر شے دنیائے امثال کے کسی نہ کسی تصور کی مادی شبیہہ ہے۔ اقبال کے حوالے سے' افلاطون کے موقف کو ماننے سے غائیت کا ایسا تصور ابھرتا ہے جس کی رو سے دنیائے موجودات پر جبریت کا اطلاق لازم آتا ہے۔ یعنی دنیائے موجودات ان امکانات کی پابند ٹھہرتی ہے جو تصورات کی صورت میں' دنیائے امثال میں آباد ہے۔ علاوہ ازیں' نقل کو اصل کا عکس قرار دینے سے عملِ تخلیق کے تصور پر کاری ضرب لگتی ہے۔

(استقرائی استدلال اور فکرِ اقبال از خالد الماس' صفحہ ۱۳۹)

منکرِ ہنگامہ موجود گشت خالقِ اعیان نامشہود گشت

(اسرارِ خودی)

اقبال حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ' اس شعر میں افلاطون کے مشہور مسئلہ اعیان کی طرف اشارہ ہے جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مسئلے کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے۔

۳۰۔ نطشے کا جنون

فطرتِ انسانی عجیب تضادات کا مجموعہ ہے۔ اگر میں کسی طوائف سے شادی کروں تو یوں ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے اس طرح کے ناگوار رشتوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جب آپ میرے اس طرزِ عمل کو حکایت کا موضوع بنائیں تو مجھے بُرا لگے گا۔ میں نظریاتی طور پر اسے رَد کرتا ہوں جس کی میں عملاً اجازت دیتا ہوں۔ نطشے کا فلسفہ کم از کم اخلاقیات کے دائرے میں، یورپ کے طرزِ عمل کو عقلی جواز فراہم کرنے کی ایک سعی ہے۔ پھر بھی یورپ میں اشرافیہ کے اس عظیم پیغمبر کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ بہت کم لوگ اس کے جنون کا مطلب سمجھ سکے ہیں۔

ا۔فریڈرک ولیم نطشے: (۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء۔ ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء) جرمن فلسفی، شاعر، موسیقار، ثقافتی نقاد اور ماہر لسانیات۔ اس کے فلسفہ قوت اور نظریہ فوق البشر کو جدید یورپ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۷۹ء میں خرابیِ صحت کی وجہ سے باسل یونیورسٹی سے مستعفی ہوا اور پھر آخر دم تک خرابیِ صحت میں مبتلا رہا۔ اقبال کی نگاہ میں نطشے کے فلسفے کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں:

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز — درنئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد — دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ برطرحِ حرم بت خانہ ساخت — قلبِ او مومن دماغش کافر است
خویش را در نارِ آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیل از آذر است
(پیامِ مشرق)

اقبال ''نیٹشا'' نامی نظم کے نوٹ میں لکھتے ہیں:نیٹشا نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں ۔'' قلب او مومن دماغش کافر است''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کا جملہ امیہ ابن الصّلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا آمن لسانہ کفر قلبہ۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!
(بالِ جبریل)

۳۱۔ اورنگزیب

اورنگزیب کی غیر معمولی سیاسی ذہانت انتہائی جامع تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا کہ اپنی ریاست کی مختلف اقوام کو ایک ہمہ گیر سلطنت کے تصور میں شامل کر لے۔ لیکن اس سامراجی وحدت کے حصول میں اس نے غلطی سے اپنے ڈٹ جانے والے ہمتی تقاضوں کو ملحوظ رکھا جس کی تائید میں سیاسی تجربہ ناکافی تھا۔ وقت کے پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی متصورہ سلطنت کے سیاسی ارتقا میں اس امید کے ساتھ اس نے ایک غیر مختتم جدوجہد کا آغاز کر دیا کہ ہندوستان کی متضاد سیاسی وحدتوں کو اپنی ہی زندگی میں متحد کر لے گا۔ اسے ہندوستان کو اصولِ اسلامی سے تطبیق دینے (مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں) میں ناکامی ہوئی جیسے پورے ایشیا پر یونان کو مسلط کرنے میں سکندرِ اعظم ناکام ہوا تھا۔ جبکہ انگریز عہدِ رفتہ کی اقوام

کے سیاسی تجربات سے لَیس ہو کر آیا اور وہ وہاں اپنے تحمل اور کچھوے جیسی ثابت قدمی کی بنا پر سرخرو ہوا جہاں اورنگزیب اپنی جلد باز ذہانت کی وجہ سے ناکام رہا۔ فتح لازماً اتحاد کے ہم معنی نہیں۔ مزید برآں سابقہ مسلمان خاندانِ سلاطین کی تاریخ نے اورنگزیب کو سمجھا دیا تھا کہ ہندوستان میں اسلام کی طاقت اس خطے میں عوام کی خیر سگالی پر نہیں جیسا کہ اس کے بزرگ اکبر نے سوچا تھا بلکہ حکمران نسل کی طاقت پر منحصر ہے مگر اپنے گہرے سیاسی ادراک کے باوجود وہ اپنے آباو اجداد کے کرتوتوں کو مٹا نہ سکا۔ سیوا جی، اورنگزیب کی فرمانروائی کی پیداوار نہ تھا۔ اس کا وجود اکبر کی حکمتِ عملی سے ظہور میں آنے والے معاشرتی اور سیاسی عوامل کا مرہونِ منت تھا۔ اورنگزیب کا سیاسی ادراک اگرچہ درست تھا لیکن بعداز وقت ثابت ہوا۔ تاہم اس ادراک کے پیشِ نظر اسے ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آیندہ نسلیں میرے اس قول کی سچائی کو تسلیم کریں گی۔ ہندوستان کے انگریز ناظموں میں، لارڈ کرزن ہی نے سب سے پہلے ہندوستان میں برطانیہ کی طاقت کی سچائی کو سمجھ لیا تھا۔ ہندو قوم پرستی غلطی سے اس کی حکمتِ عملی سے منسوب کی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقت یہ ثابت کر دے گا کہ اس کا وجود لارڈ رِپن کی حکمتِ عملی کا رہینِ منت ہے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ سیاسی غرض و ادراک پر مغل اور انگریز دونوں متفق تھے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں انگریز مورخ اورنگزیب کو بُرا بھلا کہتا ہے جس کے سامراجی نصب العین کی پیروی خود اس کے اپنے ملک والے کرتے رہے اور جس کے سیاسی ادراک کی وہ تصدیق کر چکے ہیں۔ اورنگزیب کا سیاسی طریقہ کار بہت ہی ناہموار تھا لیکن جس دَور سے اس کی زندگی اور کارنامے وابستہ ہیں اسی کے نقطۂ نگاہ سے اس طریقہ کار کی اخلاقی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

ا۔ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر: (۴ نومبر ۱۶۱۸ء۔ ۳ مارچ ۱۷۰۷ء) چھٹا مغل

بادشاہ۔ مغل بادشاہوں میں سب سے نیک اور پارسا تھا۔ کلامِ مجید لکھ کر اور ٹوپیاں بنا کر اپنی روزی پیدا کرتا تھا۔ اقبال نے اورنگزیب کے متعلق اس طرح بیان کیا ہے:

شاہ عالمگیر گردوں آستاں — اعتبارِ دودمانِ گورگاں
پایہ اسلامیاں برتر ازو — احترامِ شرعِ پیغمبر ﷺ ازو
درمیانِ کار زارِ کفر و دیں — ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

(رموزِ بے خودی)

۲۔ سکندرِ اعظم: (۳۵۶ قبل مسیح۔ ۳۲۳ قبل مسیح) ارسطو کا شاگرد۔ یونان کی ایک ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ ثانی کا فرزند۔ اس نے صرف تیس سال کی عمر میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ برصغیر کو فتح کرنے کی حسرت دل میں لیے وطن واپس جا رہا تھا کہ عراق کے مشہور شہر بابل میں مر گیا۔ اس نے یونانی تہذیب کو دنیا کے مختلف حصوں میں ایسا پھیلایا کہ اب تک اس کے آثار ملتے ہیں۔

۳۔ جلال الدین محمد اکبر: (۱۴ اکتوبر ۱۵۴۲ء۔ ۲۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) خاندانِ مغلیہ کا حقیقی بانی۔ تیرہ سال کی عمر میں اپنے باپ ہمایوں کا جانشین ہوا۔ اگرچہ وہ اَن پڑھ تھا، لیکن علم و ہنر کی سرپرستی کا اسے خاص شوق تھا۔ اس کے عہد کی تاریخ اس کے وزیر ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئینِ اکبری میں محفوظ کی۔ اس کو صوفیا سے بڑی عقیدت تھی لیکن تخت نشینی کے بیس برس بعد وہ لامذہبیت کی طرف مائل ہو گیا اور ایک نیا مذہب 'دینِ الٰہی' کے نام سے ایجاد کیا۔

۴۔ سیوا جی بھوسلے: (۱۹ فروری ۱۶۳۰ء۔ ۱۳ اپریل ۱۶۸۰ء) مرہٹہ سلطنت کا بانی۔ جو مغل سلطنت کی حدود میں مسلسل غارت گری کرتا رہا۔ مغلوں کے ساتھ اس کے اختلافات مارچ ۱۶۵۷ء میں زور پکڑ گئے۔ جب احمد نگر کے قریبی مغل علاقوں پر اس کے حامیوں نے دھاوا بول دیا۔ اورنگزیب نے اس کے جواب میں ناصر خان کو بھیجا جس نے احمد نگر کے مقام پر سیوا جی کی فوج کو شکست دی۔ ۱۶۸۰ء میں سیوا جی مارا گیا لیکن اپنے پیچھے فتنہ پرداز لٹیروں کی ایک مضبوط جماعت چھوڑ گیا۔

۵۔ سر جارج نیتھانیل کرزن: (۱۱ جنوری ۱۸۵۹ء۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۵ء) جنوری ۱۸۹۹ء میں وائسرائے ہند مقرر ہوا۔ اس کو آزاد قبائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی نے ایک نیا صوبہ شمال مغربی

سرحدی صوبہ بنایا۔جس کا نیا نام اب خیبر پختونخوا ہے۔۱۹۰۵ء میں وہ مستعفی ہو کر واپس انگلستان چلا گیا۔

حضرتِ کرزن کو اب فکرِ مداوا ہے ضرور
حکم برداری کے معدے میں ہے دردِ لایطاق
(بانگِ درا)

۶۔جارج فریڈرک سیموئیل رابنسن۔لارڈ رِپن(۲۴ اکتوبر ۱۸۲۷ء ۔ ۹ جولائی ۱۹۰۹ء) ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک وائسرائے ہند رہا۔۱۸۶۱ء سے اپنی وفات کے ایک برس پہلے تک وہ ہر لبرل کابینہ میں اپنی سیاسی خدمات انجام دیتا رہا۔

۳۲۔فارس کی فتح

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اسلامی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ کون سا ہے تو میں بلا ہچکچاہٹ کہوں گا 'فارس کی فتح'۔ نہاوند کی لڑائی نے عربوں کو نہ صرف ایک خوبصورت ملک دیا بلکہ ایک ایسی قدیم تہذیب دی یا زیادہ بہتر طور پر یوں کہنا چاہیے کہ ایسی قوم سے آگاہی دی جو سامی اور آریائی مواد سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی۔ ہماری اسلامی تہذیب سامی اور آریائی تصورات کی باہمی پیوند کاری کی پیداوار ہے۔ یہ ایسے نوعمر کی طرح ہے جس کو دھیما پن اور شائستگی اس کی آریائی ماں سے اور پختہ کردار اس کے سامی باپ سے تَر کے میں ملا۔ لیکن فارس کی فتح کے بغیر اسلامی تہذیب یک طرفہ رہ جاتی۔ فارس کی فتح سے ہمیں وہی کچھ ملا جو کہ رومیوں کو یونان کی فتح سے ملا تھا۔

ا۔نہاوند کی لڑائی: عربوں اور ساسانیوں کی پہلی لڑائی قادسیہ کے میدان میں ہوئی۔ یہ لڑائی ۱۶ ہجری بمطابق ۶۳۷ء میں لڑی گئی۔ اسی نے ساسانی سلطنت کی قسمت پر قضا و قدر کی آخری مہر لگائی۔ یہ لڑائی چار دن جاری رہی۔ اس شکست کے بعد ساسانی کہیں بھی نہ ٹھہر سکے۔ چند سالوں میں پوری ساسانی سلطنت عربوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس لڑائی کو ''معرکہ فتح الفتوح'' بھی کہا جاتا ہے۔

۳۴۔ غالب

جہاں تک مرزا غالب بحثیت ایک فارسی شاعر کے متعلق میری رائے کا تعلق ہے غالباً یہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے واحد مستقل عطیہ ہے۔ جس سے عمومی اسلامی ادب میں اضافہ ہوا۔ واقعی وہ ان شعرا میں سے ہے جن کی قوتِ متخلیہ اور ذہانت، انہیں عقائد اور قومیت کی تنگ بندیوں سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اس کی قدر افزائی کا حق ادا کرنا ابھی باقی ہے۔

ا۔ مرزا اسد اللہ بیگ خان: (۲۷دسمبر ۱۷۹۷ء۔ ۱۵فروری ۱۸۶۹ء) کلاسیکی اردو اور فارسی شاعر۔ غالب اور اسد تخلص کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں مغلوں کا زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانوی راج کا مشاہدہ کیا تھا۔ اُردو غزلوں اور فارسی کلیات کے علاوہ مہرِ نیم روز، اُردوئے معلّی اور عودِ ہندی غالب کی مشہور کتابیں ہیں۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لیے جن شعرا کے اسالیبِ فن سے استفادہ کیا، ان میں غالب کو اولیت حاصل ہے۔ ۱۹۰۱ء میں 'مرزا غالب' کے عنوان سے ایک نظم میں غالب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ جس کا یہ شعر اس کا منہ بولتا ثبوت ہے:

لطفِ گویائی میں تری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
(بانگِ درا)

۳۴۔اقوام کی تربیت

کسی خارجی حکومت کا بے غرض ہونا ایک امر محال ہے۔پھر بھی اقوام کی سرپرستی ایک ضرورت ہے۔بعض اوقات اس طرح کی تربیت کے معاوضے میں کسی قوم کو روٹی سے محروم رہنا پڑتا ہے۔اہلِ میکسیکو نے اہلِ ہسپانیہ کے ماتحت جابرانہ مراحل میں تکالیف برداشت کی تھیں تب جا کر وہ اپنے انتظامی معاملات کی ذمہ داری نبھا سکے۔

۳۵۔نظم کی مقبولیت

کسی نظم کی مقبولیت اس بات پر منحصر نہیں کہ اس میں منطقی سچائی کو کس حد تک دکھایا گیا ہے۔گولڈ سمتھ کی 'ویران گاؤں' نہایت ہر دلعزیز ہے تاہم یہ نظم سائنسی عدمِ صحت اور معاشی استدلال کے مغالطوں سے بھری پڑی ہے۔

۱۔ اولیور گولڈ سمتھ: (۱۰ نومبر ۱۷۳۰ء ۔ ۴ اپریل ۱۷۷۴ء) انگریز نسل کا آئرش مصنف اور شاعر۔ جو اپنے ناول 'ویکفیلڈ کے پادری' اور اپنی شہرہ آفاق نظم 'ویران گاؤں' سے پہچانا جاتا ہے۔

۲۔ ویران گاؤں (Deserted Village): ۱۷۶۰ء میں ایک قدیم گاؤں کے انہدام کے مشاہدہ کے بعد اولیور گولڈ سمتھ نے ۱۷۷۰ء میں شائع کی۔جس میں اس نے اس خوف کا اظہار کیا کہ دیہات کی تباہی اور پیداواری زمین سے باغات کا تبادلہ کسانوں کو برباد کردے گا۔یہ نظم چار سو تیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔

۳۶۔ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور وَرڈز ورتھ

مجھے اعتراف ہے کہ میں ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ کا بہت مقروض ہوں۔ پہلے دو نے اشیا کے باطن کو جانچنے میں میری رہنمائی کی؛ تیسرے اور چوتھے نے مجھے سکھایا کہ شاعری کے مثالی مغربی خارجیت میں رَچ بس جانے کے بعد اس کی روح اور اظہار کو کیسے مشرقی رکھوں اور آخری نے مجھے میرے طالب علمی کے دِنوں میں دہریت سے محفوظ رکھا۔

۱۔ہیگل (دیکھیے خیال نمبر۱۱ ''ہیگل کا نظامِ فلسفہ'' صفحہ۴۵)

۲۔گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ۷۹)

۳۔غالب (دیکھیے خیال نمبر۳۳ ''غالب'' صفحہ۶۹)

۴۔مولانا ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل: (۱۶۴۲ء۔۱۷۰۲ء) فارسی شاعر جو کہ بیدل دہلوی کے نام سے مشہور ہیں۔انہوں نے بہت سی غزلیں اور رُباعیاں لکھیں ۔وہ شاعری کی سولہ کتابوں کے مصنف تھے۔ فارسی ادب کی شاعری میں بیدل کا منفرد انداز انہیں ہندوستان میں ممتاز بناتا ہے۔غالب اور اقبال دونوں ان سے متاثر تھے۔ان کی مشہور کتابوں میں طلسمِ حیرت، طورِ معرفت، چہار عنصر اور رقعات شامل ہیں۔

۵۔ولیم ورڈز ورتھ: (۷اپریل ۱۷۷۰ء ۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۰ء) فطرت پرست رومانوی شاعر۔جس نے سیموئیل ٹیلر کولرج کے ساتھ مل کر انگریزی ادب میں رومانوی دور شروع کیا۔ ۱۸۴۳ء میں ساؤدی کے بعد ملک الشعراء کا اعزاز حاصل کیا۔ورڈز ورتھ کے خیالات، شیخ محی الدین ابنِ عربی کی وحدت الوجودی تعلیمات سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔

۳۷۔ حکایتیں

زندگی کی عمیق ترین سچائیوں کی حکایتوں کی صورت میں بلا تصنع وضاحت کے لیے غیر معمولی ذہانت درکار ہے۔ غالباً محض شیکسپیئر، مولانا روم (جلال الدین) اور یسوع مسیح ہی ذہانت کی اس نایاب علامت کی مثالیں ہیں۔

۱۔ شیکسپیئر (دیکھیے خیال نمبر۱۱۲ ''شیکسپیئر اور گوئٹے'' صفحہ۱۰۹)

۲۔ مولانا جلال الدین رومی (۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء۔ ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء) فلسفہ اسلام اور تصوف کا سب سے بڑا مفسر۔ اسلامی تصوف اور فلسفہ پر فارسی زبان میں رومی کی تصنیف 'مثنوی' بڑی شہرت رکھتی ہے۔ اقبال خود کو مولانا رومی کے سامنے زانو تلمذ تہہ فرماتے ہیں اور ان کو اپنا رہبر اور مرشد معنوی قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ اقبال نے شاعری کے لیے نئے موضوعات، متنوع اسلوب اور متفرق انداز متعارف کروائے۔ اقبال اپنی تمام تر جدت پسندی اور فکری و فنی ابتکار کے باوجود خود کو مرید ہندی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف!
(بالِ جبریل)

تُو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال!
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
(بالِ جبریل)

۳۔ مسیح (دیکھیے خیال نمبر۲۸ ''مسیح اور سپنوزا'' صفحہ۶۰)

۳۸۔ عالمی تہذیب میں یہودی شراکت

عالمگیر تہذیب کے ارتقا میں یہودی عنصر کی مقدار اتنی ہے کہ اسے ناقابلِ ذکر خیال نہیں کیا جاسکتا۔ یہودی غالباً کاروباری اخلاقیات کے قوانین وضع کرنے میں پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان قوانین کو ہم خلاصتاً تصورِ دیانت کہہ سکتے ہیں۔

۳۹۔ مازنی

مازنی کا حقیقی دائرہ عمل ادب تھا نہ کہ سیاست۔ سیاست سے اس کے شغف نے اٹلی کو اتنا نفع نہیں دیا جتنا دنیا کو نقصان پہنچایا ہے۔

ا۔ گیوسپ مازنی: (۲۲جون ۱۸۰۵ء۔۱۰مارچ ۱۸۷۲ء) اطالوی سیاستدان، صحافی اور اٹلی کے اتحاد کے لیے سرگرم کارکن۔ ۱۸۶۶ء میں اطالوی پارلیمان کا ڈپٹی لیڈر منتخب ہوا۔ اس کی کوششوں سے اٹلی آزاد ہوا اور کئی الگ الگ ریاستوں میں بٹنے کی بجائے متحد رہا۔ اس نے ایک جمہوری ریاست کے لیے جدید یورپی تحریک کی بھی وضاحت کی۔

۴۰۔ مابعد الطبیعیات پر سائنس کا انحصار

جدید سائنس کو مابعد الطبیعیات کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے۔ یہ مابعدالطبیعیات کا ماہر لیبنز ہی تھا جس نے سائنس کو پہلی دفعہ مادے کا عملی تصور دیا۔اس نے کہا ''مادہ'' لازمی طور پر ''قوتِ مزاحمت'' ہے۔ مابعدالطبیعیات سے یہ تصور عاریتاً لے کر سائنس از خود قوت کے اس رویے کا مطالعہ کرنے کے لیے وقف ہے اور یہ واضح ہے کہ وہ از خود اسے دریافت نہیں کر سکتی تھی۔

ا۔گوٹفریڈ ولیم وون لیبنز: (یکم جولائی ۱۶۴۶ء۔۱۴ نومبر ۱۷۱۶ء) جرمن فلسفی اور ریاضی دان۔ اس نے بہت سی زبانوں میں لکھا لیکن زیادہ تر کام فرانسیسی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں کیا۔ اس کا شمار مغرب کے اعلیٰ پایہ کے فلسفیوں اور ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔

۴۱۔ جدید سائنس اور جمہوریت

خیالات ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ سیاست میں انفرادیت کی بڑھتی ہوئی روح معاصر سائنسی فکر پر لازماً اثر انداز ہوتی ہے۔ جدید سوچ کائنات کو زندہ جوہروں کی ایک جمہوریہ قرار دیتی ہے۔

۴۲۔خیالات کا اپنے سیاق وسباق سے تعلق

فکر کی ترقی کو انسانی سرگرمیوں کے دیگر پہلوؤں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔فلسفے کی تاریخ کی کتب ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف اقوام نے کیا سوچا لیکن مختلف وجوہات کی بِنا پر وہ ہمیں سماجی اور سیاسی معلومات فراہم نہیں کرتیں جن سے فکرِ انسانی کا کردار متعین ہوا۔فلسفے کی مکمل تاریخ تحریر کرنا یقیناً ایک بہت ہی بڑا کام ہو گا۔محض ایک ماہرِ دینیات کے بس کی بات نہیں کہ وہ مکمل طور پر لوتھر کی تحریکِ اصلاح کے بھرپور محتویات کا انکشاف کر سکے۔ہمارا یہ عمومی رُجحان ہے کہ ہم انسان کی ذہنی سرگرمی کے عام دھارے سے عظیم خیالات کو علیحدہ کر دیتے ہیں۔

۱۔مارٹن لوتھر:(۱۰نومبر ۱۴۸۳ء ۔ ۱۸فروری ۱۵۴۶ء) جرمن راہب' پادری' عیسائیت کا بہت بڑا مصلح۔جب وہ ۱۵۱۱ء میں روم گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں بدکاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کھلم کھلا ''گناہوں کی معافی'' فروخت ہو رہی ہے۔لوتھر سے یہ صورتِ حال دیکھی نہ گئی اور اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ پوپ کو دوسروں کے گناہوں کو معافی دینے کا کوئی حق نہیں۔اس نے یہ بھی کہا کہ عبادت خانوں کے معائنے' متبرک دن اور زیارت کے ایام کا تعین اور پادریوں کی شادی کا انتظام بھی ہوتا کہ وہ کسی بُرے فعل کے مرتکب نہ ہوں۔یہ تحریک تقریباً تمام یورپی ممالک میں پھیلی۔مارٹن لوتھر نے عیسائیت میں ایک نئے فرقے ''پروٹسٹنٹ'' کی بنیاد رکھی۔

دیکھ چکا المنی' شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
(بالِ جبریل)

۴۳۔ کثرتِ ازدواج

کثرتِ ازدواج کے رائج ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ اسے ہمہ گیر رواج کے طور پر لیا جائے۔ بعض پیچیدگیوں کے حل کے لیے اس کی اجازت دی گئی تھی جو صرف اسلامی معاشرے کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ اسلام کے مطابق حلال چیزوں میں سب سے بُری چیز ''طلاق'' ہے۔ کثرتِ ازدواج کو کچھ اس لیے برداشت کیا گیا کہ طلاق کہیں ایک عام معاشرتی رُجحان نہ بن جائے۔ دو سماجی بُرائیاں طلاق اور کثرتِ ازدواج (اگر عام ہو جائیں) تو موخرالذکر یقیناً کم تر بُرائی ہے۔ لیکن طلاق سے بچنا ہی غالباً اس رواج کا واحد جواز نہیں یہ جزوی طور پر مرد کی فطرت پر ایک رعایت ہے۔ اس رعایت سے وہ اپنے فطری میلانِ تنوع کو پورا کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے نتیجے میں جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے؛ اس سے برأت بھی اُسے حاصل نہیں ہوتی۔ برطانیہ میں اس طرح کے میلانات کو پورا کرنے کے مواقع کچھ لوگوں کو میسر ہیں۔ لیکن قانون انہیں مکمل طور پر ان ذمہ داریوں سے آزاد کر دیتا ہے جو جنسی آزادی کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ ان بچوں کی تعلیم کا ذمہ دار نہیں ہوتا جنھیں وہ جنم دیتا ہے۔ ایسی اولاد اپنے باپ کا ترکہ بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے بعض معاملات میں نتائج بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ فرانس سماج کی ایک رسم کے طور پر عصمت فروشی کو تسلیم کرنے میں مجبور ہو چکا ہے جس کو صحت مند رکھنا ریاست کی بھیانک ذمہ داری ہے۔ لیکن شاید بیشتر یورپی ممالک میں یک زوجگی پر سب سے بڑی تنقید فاضل خواتین کا وجود ہے؛ جہاں سماجی اور سیاسی عوامل خواتین کی تعداد میں کثرت کا باعث ہیں جنہیں خاوند میسر نہیں آتے۔ وہ مائیں نہیں بن سکتیں اور نتیجتاً بچوں کی پرورش کے علاوہ وہ دوسری دلچسپیوں کو حاصل کرنے میں کارفرما ہیں۔ وہ مجبور ہیں

کہ بچوں کی بجائے خیالات کی ''پرورش'' کریں۔حال ہی میں ایک متاثر کن خیال ''ووٹ برائے خواتین'' نے ان میں جنم لیا ہے۔یہ واقعی فاضل خواتین کے حق میں یا یوں کہیے کہ ان کی طرف سے ایک کوشش ہے تا کہ سیاست کے دائرے میں ان کے لیے ''دلچسپیاں'' پیدا کی جائیں۔اگر ایک معاشرہ بچوں کی پیدائش اور پرورش کی عورتوں کو اجازت نہیں دے سکتا تو انہیں اس کے علاوہ کچھ اور دینا ہوگا جس سے وہ مصروف رہیں۔یورپ میں حقِ رائے دہی برائے نسواں کی تحریک کے پیچھے ووٹوں کی بجائے خاوندوں کے لیے پکار ہے۔ میرے لیے تو یہ بے روزگاروں کے ہاؤ ہو سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ا۔ ووٹ برائے خواتین کی تحریک: خواتین کے ووٹ ڈالنے کے حق کی تحریک انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ اور امریکہ میں چلی۔یہ زیادہ تر وہ خواتین تھیں جو اعلیٰ اور متوسط طبقے کی نمائندہ تھیں' جو اپنی سماجی اور اقتصادی صورتِ حال سے مایوس تھیں۔اس ضمن میں سب سے پہلے خواتین کو حقِ رائے دہی استعمال کرنے کی اجازت ۱۸۹۳ء میں حکومت نیوزی لینڈ نے دی۔

۴۴۔جرمن قوم کا روحانی نصب العین

یہ گوئٹے کی فاوسٹ ہے نہ کہ وہ کتابیں جو گلیلیائی ماہی گیروں کی تصانیف سمجھی جاتی ہیں جو کہ جرمن قوم کے روحانی نصب العین کا انکشاف کرتی ہے اور جرمن مکمل طور پر اس سے آگاہ ہیں۔

ا۔گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ ''گوئٹے کی فاوسٹ'' صفحہ ۷۹)

۴۵۔ دشمن سے محبت

محبت اکسیر سے بڑھ کر ہے۔ مفروضہ ہے کہ موخر الذکر ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر دیتی ہے جبکہ اول الذکر تمام ادنیٰ جذبات کو اپنے وجود میں بدل دیتی ہے۔ مسیح اور بدھا نے محبت کی نوعیت کا بالکل صحیح ادراک کیا۔ لیکن اخلاقی اصول پرستی کے جذبات میں وہ زندگی کے حقائق کو نظر انداز کر گئے۔ ایسی توقع رکھنا بڑی زیادتی ہے کہ انسان اپنے دشمنوں سے محبت کرے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ غیر معمولی افراد نے اس قول کو عملی جامہ پہنایا ہو لیکن قومی اخلاق کے اصول کے طور پر یہ قول غلط ثابت ہوتا ہے۔ روس جاپان جنگ کے نتائج مختلف ہوتے اگر جاپانی ان اخلاقی اصولوں پر کار بند ہوتے جو ان کے مذہب کے ساتھ منسلک ہیں۔

۱۔ مسیح (دیکھیے خیال نمبر ۲۸ ''مسیح اور سپنوزا'' صفحہ ۶۰)

۲۔ بدھا (دیکھیے خیال نمبر ۲۷ ''یورپی عیسائیت'' صفحہ ۵۹)

۳۔ روس جاپان جنگ: (۸ فروری ۱۹۰۴ء ۔ ۵ ستمبر ۱۹۰۵ء) بیسویں صدی کی پہلی بڑی لڑائی۔ روس نے بحرالکاہل پر اپنی بحریہ اور سمندری تجارت کے فروغ کے لیے گرم پانی کے ساحل پر قبضے کی کوشش کی۔ جس میں جاپان نے روس کو شکست دی اور اس کے بحری بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اس لڑائی سے مشرقی ایشیا میں طاقت کا توازن قائم ہوا۔

۴۶۔ تصورات

افراد اور اقوام کو فنا ہے لیکن ان کی اولاد یعنی خیالات و تصورات کبھی نہیں مرتے۔

۴۷۔ اقوامِ مغرب کی ذمہ داری

کسی انگریز نے مجھے ایک مرتبہ بتایا کہ اسے یہودیوں سے نفرت تھی کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کے محبوب ترین لوگ ہیں۔ ایک ایسا عقیدہ جس سے دوسری اقوام کی توہین کا پہلو بلکہ غالباً اس کا جواز مہیا ہوتا ہے۔ اسے یاد نہیں رہا کہ مشہور اصطلاح ''اقوامِ مغرب کا بارِ امانت'' کی آڑ میں ایسا ہی ایک عقیدہ مختلف پیرائے میں پنہاں ہے۔

۴۸۔ گوئٹے کی فاؤسٹ

گوئٹے نے ایک معمولی داستان کو چنا اور اسے انیسویں صدی کے مکمل تجربہ سے معمور کر دیا بلکہ اس سے بھی زیادہ اس میں نسلِ انسانی کے تمام تجربات سمو دیئے۔ ایک معمولی داستان کو انسانی حتمی نظریہ کے منظم اظہار میں ڈھال دینا

کسی خدائی کاریگری سے کم نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بے ہنگم ہیولیٰ سے ایک دلکش کائنات تخلیق کر دی جائے۔

۱۔ جوہان وولف گانگ وان گوئٹے: (۲۸ اگست ۱۷۴۹ء۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء) جرمن ادبیات کا بادشاہ۔ فان ہیمر کے ترجمہ دیوانِ حافظ سے متاثر ہو کر گوئٹے نے اپنا ''دیوانِ مغرب'' مرتب کیا جو اقبال کے فارسی مجموعہ کلام ''پیامِ مشرق'' کی تصنیف کا محرک ہوا۔ گوئٹے کو بیک وقت مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی۔ گوئٹے نہ صرف اپنے عہد کا ممتاز شاعر و ادیب تھا بلکہ موجودہ زمانے میں بھی اس کی عظمت مسلم ہے۔

۲۔ فاؤسٹ: گوئٹے کی منظوم داستان جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ فاؤسٹ گوئٹے کا سب سے مشہور کام ہے جو جرمن ادب کے عظیم کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ گوئٹے نے ۱۸۰۸ء میں حصہ اول کو مکمل کیا۔ جبکہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۲۹۔۱۸۲۸ء میں شائع ہوا جس کی آخری دفعہ ترمیم خود گوئٹے نے کی تھی۔ جبکہ حصہ دوم ۱۸۳۱ء میں مکمل ہوا اور اس کی اشاعت ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ اقبال نے اپنی نظم ''جلال اور گوئٹے'' میں بھی فاؤسٹ کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے:

نکتہ دانِ المنی را دارم   صحبتے افتاد با پیرِ عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب   نیست پیغمبر و لے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرارِ قدیم   قصہ پیمانِ ابلیس و حکیم

(پیامِ مشرق)

''نکتہ دانِ المنی سے مراد گوئٹے ہے۔ جس کا ڈراما ''فوسٹ'' مشہور و معروف ہے۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آ سکتا''۔

(اقبال)

۴۹۔ ملٹن

ملٹن کی کٹر عیسائی الٰہیات ہمارے دور کی قوتِ متخیلہ کی جانب اپنی توجہ مبذول نہیں کروا سکتی۔ قلیل تعداد میں لوگ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ والٹیئر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ملٹن کی مقبولیت برابر بڑھتی جائے گی کیونکہ کوئی بھی اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ تاہم ملٹن میں ایک بات ہے۔ کوئی بھی شاعر اپنے مقصد میں اس سے زیادہ سنجیدہ نہیں رہا۔ اس کا انداز' جھوٹے دیوتاؤں پر ایک شاندار حرم' زمانے کے مفلوج ہاتھوں سے مَس ہوئے بغیر ہمیشہ اسی طرح قائم رہے گا۔

۱۔ جان ملٹن: (۹ دسمبر ۱۶۰۸ء۔ ۸ نومبر ۱۶۷۴ء) انگریز شاعر۔ ۱۶۵۲ء میں بینائی سے محروم ہو گیا۔ اس نے بیک وقت مذہبی اور سیاسی انقلابات پر لکھا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی اخلاقی نظم ''پیراڈائز لوسٹ'' ہے۔ ملٹن کی شاعری اور نثر ذاتی اعتقاد اور آزادی اور خود ارادیت کے لیے جذبہ پیدا کرتی ہے۔

۲۔ فرانکوئس ماری آروے: (۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء۔ ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء) طنز و تفنن کا بادشاہ۔ والٹیر کے نام سے شہرت پائی۔ اس نے بہت سے ڈرامے' افسانے' ناول' طنزیہ مضامین اور نظمیں لکھیں جو مغربی ادب میں لافانی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نے رومانیت کی ابھرتی ہوئی ادبی تحریک کو بہت متاثر کیا۔

۵۰۔آسکر وائلڈ کی رُوح

آسکر وائلڈ کی رُوح انگریزی سے زیادہ ایرانی ہے۔

ا۔آسکر فنگل اوفلاہری وِنز وائلڈ: (۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء ۔ ۳۰ نومبر ۱۹۰۰ء) شاعر، طنز نگار، ڈرامہ نویس، فن برائے فن کے نظریے کا علمبردار۔ ۱۸۸۰ء میں اپنی پہلی اشاعت کے بعد ۱۸۹۰ء کی دہائی میں وہ لندن کا سب سے بڑا ڈرامہ نویس تھا۔ وہ آج اپنے منظوم چٹکلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

۵۱۔لٹیری اقوام

فضول خرچ انسان خود فطرت کا آفریدہ ہے۔ فطرت کو یہ بات پسند نہیں کہ چند افراد کے ہاتھوں میں کثیر دولت جمع ہو جائے۔ جب کسی خاندان کا مربی دولت کا ڈھیر لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تیسری یا دوسری نسل میں ہی ایک فضول خرچ پیدا ہو جاتا ہے جو ساری دولت کو منتشر کر دیتا ہے۔اگر فطرت کا یہ کارندہ نہ ہو تو دولت کی گردش بند ہو جائے۔ افراد کی طرح اقوام کے لیے بھی یہ بات درست ثابت ہوئی ہے۔ جب ایک قوم، لگاتار محنت یا کسی اور ذریعے سے دولت کے ذخائر جمع کرتی ہے تو اس طرح عالمی صنعت کا پہیہ رُک جاتا ہے جو دولت کی مسلسل گردش پر ہی منحصر ہوتی ہے۔لٹیری اقوام اس منظر پر نمودار ہوتی ہیں اور مقید دولت کو آزاد کر دیتی ہیں۔ وارن ہیسٹنگز، کلائیو اور محمود ایسی ہی اقوام کے نمائندہ ہیں جو عالمی صنعت کی ترقی کے نادانستہ کارکن

ہیں۔ وارن ہیسنگز کی لُوٹ مار کی صحیح تشریح ہمیں ستارھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں یورپی نظامِ زر کی تاریخ میں ملتی ہے۔

۱۔وارن ہیسٹنگز: (۶ دسمبر ۱۷۳۲ء۔۲۲ اگست ۱۸۱۸ء) ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۵ء تک ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل۔ ۱۷۸۷ء میں اُس پر بددیانتی اور ظلم جبر کے الزامات پر ایک مقدمہ چلا۔ لیکن ۱۷۹۵ء میں بَری ہو گیا۔

۲۔رابرٹ کلائیو: (۲۹ ستمبر ۱۷۲۵ء۔ ۲۲ نومبر ۱۷۷۴ء) جنگِ پلاسی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور سیاسی بالادستی کو مستحکم کیا۔اس پر بھی مقدمہ چلا لیکن بَری ہو گیا۔

۳۔سلطان محمود غزنوی: (۲ نومبر ۹۷۱ء۔ ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء) غزنی کا ممتاز حکمران۔اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ ۱۰۲۶ء میں سومنات کو فتح کیا اور ہندوؤں کا زور توڑ دیا۔ سومنات کے حملہ کے موقع پر محمود غزنوی کو ایک بھاری رقم اس لیے پیش کی گئی تھی کہ وہ سومنات کی فتح کے بعد مندر کے بتوں کو نہ توڑے۔محمود نے اس رقم کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں بت شکن کہلانا پسند کرتا ہوں نہ کہ بت فروش۔

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستہ ای بندہ شدی ایاز را
(پیامِ مشرق)

۵۲۔انسان کی یادداشت

انسان کی یادداشت عام طور پر ناقص ہوتی ہے۔اُسے کم یاد رہتا ہے سوائے ان جذبات کے جن سے اُسے اپنے ابنائے جنس سے ٹھیس پہنچتی ہے۔

۵۳۔ مسلم ممالک میں تفریحات

مسلم ممالک میں تفریحات نہیں ہیں۔ نہ تھیٹر، نہ موسیقی کے ہال، نہ سنگیت خس کم جہاں پاک۔ تفریح کا شوق ایک مرتبہ پورا ہو جائے تو جلد ہی نہ بُجھنے والی پیاس جیسا ہو جاتا ہے۔ یورپی ممالک کا تجربہ واضح طور پر اس شرمناک حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ مسلم ممالک میں تفریحات کی عدم موجودگی نہ تو غربت، نہ ہی جبری کفایت اور نہ ہی لطف اندوزی کے لیے احساس کے کند ہو جانے کی علامت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ممالک کے لوگ اپنے گھروں کے پُرسکون حلقوں میں کافی تفریح اور لطف حاصل کر لیتے ہیں۔ یورپی تبصرہ نگار کو مسلمانوں کی خانگی زندگی پر الزام لگانے میں اتنا جلد باز نہیں ہونا چاہیے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گھریلو خوشی کے نتیجے کے طور پر بیرونی تفریح سے بے حسی ضروری نہیں اور نہ ہی تفریحات کا شوق گھریلو زندگی کی ناخوشگواری کی علامت ہے۔

۵۴۔ اقلیّتوں کی طاقت

دنیا کے مقدر کا فیصلہ اصولی طور پر اقلیتوں سے ہی ہوا ہے۔ یورپ کی تاریخ اس دعوے کی صداقت پر کافی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی ایک نفسیاتی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں اقلیتیں کیوں کر ایک طاقتور عنصر بنی ہیں۔ کردار ہی وہ غیر مرئی طاقت ہے جو اقوام کے مقدر کا تعین کرتا ہے اور ایک موثر کردار محض اکثریت میں ہی ممکن نہیں۔ یہ تو ایک طاقت ہے جتنی تقسیم ہوتی ہے اسی قدر کمزور ہو جاتی ہے۔

۵۵۔ارتیاب اور مذہب

کچھ لوگ شکی ہوتے ہوئے بھی مذہبی رجحانِ طبع رکھتے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق ریناں اپنے ارتیاب کے باوجود اپنے ذہن کے بنیادی مذہبی کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ لوگوں کے طرزِ فکر سے ان کے کردار کے متعلق اپنی رائے کی تشکیل میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔

ا۔ جوزف ارنسٹ ریناں: (۲۸ فروری ۱۸۲۳ء۔۱۲ اکتوبر ۱۸۹۲ء) مشرق وسطیٰ کی قدیم زبانوں اور تہذیب کا ماہر، فلسفی اور مصنف۔ اس کی وجہ شہرت قوم پرستی اور قومی تشخص کے بارے میں ابتدائی عیسائیت اور اس کے سیاسی نظریات پر بااثر تاریخی کام ہے۔

۵۶۔عرب کی شاعری

''میرے چچا کا لڑکا کھڑی چٹان کے کنارے پر چلا جا رہا ہے۔ کیا میں پُشت سے جا کر اُسے سنگلاخ وادی میں دھکیل دوں تا کہ اس کی زندگی کے افق پر پھر نئی سحر طلوع نہ ہو؟ اس کے رویے کے پیشِ نظر ایسے میں میرا یہ جواز پیش کرنا بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ فعل کمینہ پن اور غیر مردانہ وار ہوگا''۔

یہ ایک عرب شاعر حماسہ میں کہتا ہے۔ اس عبارت کا ٹکڑا عربی شاعری میں ایک مثالی نمونے کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شاعری اتنی براہ راست، اتنی دوٹوک اور مردانہ جذبات سے اس قدر پُر نہیں۔ عرب شاعر شدت کے ساتھ حقیقت سے منسلک ہے۔ رنگینی کلام کی آب و تاب اُسے گرویدہ نہیں بنا سکتی۔ تاہم شاعر متنبیؔ ایک استثنیٰ ہے لیکن وہ صرف زبان کے طور پر عرب کا شاعر ہے معنوی طور پر وہ کلیتاً ایرانی ہے۔

ا۔حماسہ: عرب کی شاعری کا گلدستہ جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ جسے نویں صدی میں ابوتمام نے مرتب کیا۔اس میں نظموں کی گروپ بندی موضوع کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ کلام منتخب آٹھ سو چوراسی نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ طویل ہیں۔ یہ نظمیں قبل از اسلام سے لے کر ۸۳۲ء تک کی شاعری پر مشتمل ہیں۔

۲۔ابوالطیب احمد بن الحسین المتنبی: (۹۱۵ء۔۲۳ ستمبر ۹۶۵ء) عربی زبان کا بڑا شاعر۔اس کی زیادہ تر شاعری بادشاہوں کی تعریف پر مبنی ہے۔تقریباً تین سو چھبیس نظمیں اس کی حقیقی زندگی کی نمائندہ ہیں۔اس نے نو سال کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ہمت' زندگی کا فلسفہ اور لڑائیوں کے قصے اس کے اہم موضوعات تھے۔

۵۷۔حیرت

افلاطون کہتا ہے کہ حیرت تمام علوم کی ماں ہے۔بیدل (مرزا عبدالقادر) جذبہ حیرت کو ایک مختلف نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

نزاکت ھاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برھم مزن تانشکنی رنگِ تماشا را

افلاطون کے لیے حیرت قابلِ قدر ہے کیونکہ یہ فطرت کے متعلق ہمارے تجسس کی رہنمائی کرتی ہے۔ بیدل کے لیے اپنے عقلی نتائج سے قطع نظر' اس کی فی نفسہٖ بھی ایک قدر ہے۔اس خیال کا اظہار بیدل سے زیادہ خوبصورت انداز میں ممکن نہیں۔

ا۔افلاطون (دیکھیے خیال نمبر ۹۷ ''افلاطون اور گوئٹے'' صفحہ ۱۰۳)

۲۔ بیدل (دیکھیے خیال نمبر ۳۶ ''ہیگل' گوئٹے' غالب' بیدل اور ورڈز ورتھ'' صفحہ ۷۱)

۵۸۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بحرانی دور

جہاں تک مذہبی خیالات کے ارتقا کا تعلق ہے کسی قوم کی ترقی میں اصولی طور پر تین مراحل ہیں:

۱) روایتی مذہب کی جانب ارتیاب کا رویہ۔ کورانہ عقیدہ کے خلاف ایک بغاوت۔

۲) آخر کار گراں قدر معاشرتی قوت کے طور پر مذہب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور پھر دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی مذہب کی عقل کے ساتھ مصالحت کرانے کی ایک کوشش۔

۳) یہ کوشش لازماً اختلافِ رائے کی رہنمائی کرتی ہے جس میں ایک قومی وجود کے لیے خوفناک نتائج ہو سکتے ہیں۔ اختلافِ رائے مخلصانہ نہ ہو (اور بدقسمتی سے عام طور پر یہ مخلصانہ نہیں ہوتا) تو لازمی طور پر انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اب تیسرے مرحلے میں ہیں یا شاید جزوی طور پر دوسرے اور شاید جزوی طور پر تیسرے مرحلے میں۔ میرے نزدیک یہ دور ہماری قومی زندگی میں انتہائی تشویش ناک ہے۔ لیکن میں خوش ہوں کہ مختلف نوعیت کی کچھ ایسی طاقتیں بھی کارفرما ہیں جو قوم کی یکجہتی کے تحفظ کا رجحان رکھتی ہیں۔ اگرچہ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کا اثر عارضی ہوگا۔

۵۹۔تاریخ کی توضیح

تاریخ انسانی محرکات کی صرف ایک توضیح ہے۔اس امر کا بہت امکان ہے کہ ہم روز مرہ زندگی میں اپنے معاصرین اور حتیٰ کہ اپنے گہرے دوستوں اور رفقا کے محرکات کی غلط توضیح کر دیں۔ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ ہم ان لوگوں کے محرکات کی صحیح ترجمانی کریں جو ہم سے صدیوں پہلے گزرے ہیں۔لہٰذا تاریخ کے ریکارڈ کو بڑی احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

۶۰۔مساوات

کسی تصور کی عملی قوت اُس شخصیت کی طاقت پر انحصار کرتی ہے جو اس تصور کو پیش کرتی ہے۔محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلمؐ بدھا اور یسوع مسیح تصوراتِ مساوات کے عظیم علمبردار ہیں۔تاہم دنیا میں اسلام ہی وہ قوت ہے جو مساوات کی جانب ابھی تک عمل پیرا ہے۔

۱۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (دیکھیے خیال نمبر ۲۷ ''یورپی عیسائیت'' صفحہ ۵۸)
۲۔بدھا (دیکھیے خیال نمبر ۲۷ ''یورپی عیسائیت'' صفحہ ۵۹)
۳۔یسوع مسیح (دیکھیے خیال نمبر ۲۸ ''مسیح اور سپنوزا'' صفحہ ۶۰)

۶۱۔اقدارِ اشیاء

خدا نے اشیا کی تخلیق کی؛ انسان نے اقدارِ اشیا کی۔نطشے کا کہنا ہے کہ کسی قوم کی ابدی زندگی ''اقدار'' کی غیر منقطع تخلیق پر منحصر ہوتی ہے۔اشیا پر یقیناً صنعتِ ایزدی کی مہر ثبت ہے لیکن ان کی معنویت مکمل طور پر انسانی ہے۔

ا۔نطشے (دیکھیے خیال نمبر۳۰''نطشے کا جنوں'' صفحہ ۶۳)

۶۲۔تعلیم کا انجام

آئین حیات کیا ہے؟ مسلسل جدوجہد۔پھر تعلیم کا انجام کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کے لیے تیاری۔جو قوم محض ذہنی برتری کے لیے عمل پیرا ہے وہ اس ذریعے سے اپنی کمزوری کا اظہار کرتی ہے۔

۶۳۔خدا طاقتور ہے

طاقت میں سچ سے زیادہ اُلوہیت ہے۔خدا طاقتور ہے۔تُو بھی اپنے اس خدا کی طرح ہو جا جو آسمانوں میں ہے۔

۶۴۔ طاقتور انسان

طاقتور انسان ماحول تخلیق کرتا ہے جبکہ کمزور انسانوں کو اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے۔

۶۵۔ طاقت کا چھونا

طاقت نے جھوٹ کو چھوا، اور دیکھو تو! یہ سچائی میں تبدیل ہو گئی ہے۔

۶۶۔ طاقتور انسان کا خیال

تہذیب طاقتور انسان کا ایک خیال ہے۔

٦٧۔ مہدی کے لیے انتظار

طاقت کی تجسیم۔ مہدی کے لیے انتظار چھوڑ دو۔ جاؤ اور اُس کی خود تخلیق کرو۔

ا۔حضرت امام مہدی علیہ السلام: یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آمدِ مہدی علیہ السلام کے عقیدے پر امتِ مسلمہ کا اجماع رہا ہے۔ اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے درمیان صرف ایک نقطے پر اختلاف ہے کہ اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق امام مہدی علیہ السلام پیدا ہونے کے بعد غائب ہو گئے اور ان کا دوبارہ ظہور قربِ قیامت کے وقت ہوگا۔ جبکہ اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ابھی وہ پیدا نہیں ہوئے اور ان کی ولادت ہونی ہے۔

ا) ام المومنین حضرت اُم سلمہ ﷞ فرماتی ہیں: میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''مہدی میری نسل اور فاطمہ ﷞ کی اولاد سے ہوگا۔''

ترمذی، السنن، کتاب عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی المھدی، ۴:۵۰۵، رقم:۲۲۳۱

ابوداؤد، السنن، کتاب المھدی، ۴:۱۰۷، رقم:۴۲۸۴

احمد بن حنبل، المسند، ۱:۳۷٦، رقم ۳۵۷۱

ب) اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ﷞ حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مہدی میری عترت (اہلِ بیت) سے ہوں گے، جو میری سنت کے لیے جنگ کریں گے، جس طرح میں نے وحیِ الٰہی (کی اتباع) میں جنگ کی۔''

۔نعیم بن حماد، الفتن، ۱:۳۷۱، رقم ۱۰۹۲

۔سیوطی، الحاوی اللفتاوی، ۲:۷۴

علامہ اقبال اپنے اس خیال کو اپنی نظم 'مہدیٔ برحق' میں فرماتے ہیں:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدّتِ گفتار ہے، نے جدّتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کُہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دُنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالمِ افکار

(ضربِ کلیم)

۶۸۔ قومیّت کا تصوّر

قومیت کا تصوّر یقیناً اقوام کی نشوونما میں ایک صحت مند عنصر ہے لیکن اس میں مبالغہ آمیزی کا رجحان موجود ہوتا ہے اور جب یہ مبالغہ آمیزی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اس میں فن اور ادب کے وسیع تر مقاصد کو کالعدم کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

۶۹۔ کانٹ کا امر مطلق

کوئی بھی کانٹ کے امر مطلق کی اہمیت کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ جرمن قوم کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتا۔ کانٹ کے متشدد تصورِ فرض کی مکمل تشریح وہاں ملتی ہے۔

۱۔ایمنیول کانٹ :(۲۲اپریل ۱۷۲۴ء ۔ ۱۲ فروری ۱۸۰۴ء) جرمن فلسفی ۔ اس نے فلسفۂ بشریات، اخلاقیات، مذہب، قانون، جمالیات، فلکیات اور تاریخ پر لکھا۔۱۷۸۱ء میں اس کی تصنیف 'تنقید عقلِ محض' شائع ہوئی جو فکری دنیا میں انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ اس کا مقصد عملی اور عقلیت پسند نقطۂ نظر کے درمیان تنازعات کو ختم کرنا تھا۔ اُس کے خیالات نے اُس کی زندگی میں ہی جرمنی کے بہت سے دانشوروں کو متاثر کیا۔

فطرتش ذوقِ مے آئینہ فامے آورد
از شبستانِ ازل کوکبِ خامے آورد
(پیامِ مشرق)

۷۰۔ قریب المُوت نامیاتی جسم میں نئی روح پھونکنا

ایک علیل سماجی نامیاتی عضویہ بعض اوقات اپنے اندر قوتوں کا ایسا نظام وضع کر لیتا ہے جو نامیاتی جسم کی صحت کی حفاظت کا رجحان رکھتا ہے۔ مثلاً ایک عظیم شخصیت کی پیدائش جو ایک نئے تصور کے انکشاف سے قریب المُوت عضویے میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔

۷۱۔ضبطِ نفس

ضبطِ نفس افراد میں ہوتو خاندان تعمیر ہوتے ہیں' اقوام میں ہوتو سلطنتوں کی تعمیر ہوتی ہے۔

۷۲۔بُت پرستی

اسلام اور عیسائیت دونوں کو مشترک حریف یعنی بت پرستی سے نمٹنا پڑا۔ اگر چہ فرق یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے حریف سے سمجھوتا کرلیا اور اسلام نے مکمل طور پر اسے تباہ و برباد کر دیا۔

۷۳۔مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ

مسلم قوم کی تاریخ پر آپ جتنا غور کریں گے' یہ اتنی ہی حیرت انگیز محسوس ہو گی۔ اس کی آفرینش کے دن سے لے کر سولھویں صدی کے آغاز تک؛ تقریباً ایک ہزار سال۔ یہ طاقتور نسل (میں نسل اس لیے کہتا ہوں کہ اسلام نے ایک نسل ساز کی حیثیت سے کام کیا ہے) سیاسی توسیع کے ہمہ جاذب مشغلے میں متواتر مصروف تھی۔ تاہم غیر منقطع سرگرمی کے اس ہنگامے میں اس حیرت انگیز قوم کو کافی

وقت میسر آیا جو اس نے قدیم علوم کے بیش بہا خزانوں کو باہر نکالا اور محفوظ کیا' ان میں ٹھوس اضافے کیے' منفرد نوعیت کے ادب کو تخلیق کیا اور' سب سے بڑھ کر' ایک مکمل قانونی نظام تکمیل کو پہنچایا جو ہمارے لیے مسلم ماہرین قانون کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔

۷۴۔ دنیا کی تعمیرِ نو

سیرت اور صحت مند قوتِ تخلیق حاصل ہو تو گناہ اور غم کی اس دنیا کی تعمیر نو ممکن ہے تا کہ یہ ایک حقیقی جنت بن جائے۔

۷۵۔ تکلیف

تکلیف خدا کی جانب سے ایک عطیہ ہے تا کہ انسان زندگی کا مکمل مشاہدہ کر لے۔

۷۶۔ لامتناہی

کسی ریاضی دان کا خط لامتناہی نہیں ہو سکتا جبکہ شاعر ایک مصرع میں لامتناہیت کو سمو سکتا ہے۔

۷۷۔شاعر اور روحِ ارضی

روحِ کُل اپنی داخلی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو علامات میں مخفی رکھتی ہے۔ کائنات ایک ایسی ہی عظیم علامت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن روحِ کُل ہمارے لیے ان علامات کی تشریح کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ یہ شاعر کا فرض ہے کہ ہمارے لیے ان علامات کی تشریح بیان کرے۔ ان کی تشریح بیان کرنا شاعر کا فرض ہے اور انسان پر ان کا مفہوم واضح کرنا بھی۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اور روحِ ارضی ایک دوسرے کے مخالف ہیں کیونکہ مؤخرالذکر جو کچھ پوشیدہ رکھتی ہے اول الذکر اسے ظاہر کر دیتا ہے۔

۷۸۔غیر واضح اور غیر معروف

میتھیو آرنلڈ ایک بہت ہی محتاط شاعر ہے۔تاہم مَیں شاعری میں کسی حد تک اخفا اور ابہام کا عنصر پسند کرتا ہوں' کیونکہ غیر واضح اور مبہم اندازِ ابلاغ جذباتی اعتبار سے بہت معنی خیز ہوتا ہے۔

ا۔میتھیو آرنلڈ (دیکھیے خیال نمبر۲۶ ''حیات بطور شاعری پر تنقید'' صفحہ۵۷)

۷۹۔تاریخ کا گراموفون

تاریخ ایک بہت بڑے گراموفون کی طرح ہے جس میں اقوام کی آوازیں محفوظ ہیں۔

۸۰۔گناہ اور تقویٰ

کم از کم ایک حوالے سے گناہ تقویٰ سے بہتر ہے۔اول الذکر میں تخیل کا عنصر پایا جاتا ہے جس سے موخر الذکر محروم ہے۔

......

تراش از تیشہ خود جادہَ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است
(پیامِ مشرق)

۸۱۔نیک لوگ

گناہ کی اپنی ایک تعلیمی اہمیت ہے۔نیک لوگ اکثر نادان ہوتے ہیں۔

۸۲۔ عمل کے بغیر غور و فکر

زندگی بھی شاعری اور مصوّری کے فنون کی طرح مکمل طور پر اظہار ہے۔ عمل کے بغیر غور و فکر موت ہے۔

۸۳۔ زندگی میں کامیابی

زندگی میں کامیابی عزم کی ہی رہینِ منت ہے نہ کہ عقل کی۔

۸۴۔ ایک عوامی رہنما کے لیے

اگر آپ ایک عوامی رہنما بننا چاہتے ہیں تو لوگوں کے نازنخروں کے بارے میں آپ کو جاننا چاہیے۔ان کی فرسودہ اقوال سے اور اگر ضروری ہوتو جھوٹ سے تواضع کریں۔

۸۵۔ ایک کامیاب انسان

اپنی حدود کو پہچانو، اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگاؤ اور پھر زندگی میں آپ کی جیت یقینی ہے۔

۸۶۔ کاہل دماغ

کاہل دماغ پودے جیسا ہی ہوتا ہے؛ یہ رقص نہیں کرسکتا۔

۸۷۔ تکلیف کی اخلاقی قدر

کوئی مذہبی نظام تکلیف کی اخلاقی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ عیسائیت کے معماروں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے تکلیف کی محض حیثیت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی اور دوسرے عوامل کی اخلاقی قدر کو نظر انداز کر دیا۔ تاہم حسین لیکن یک طرفہ یونانی نصب العین کی کمی پوری کرنے کے لیے یورپی ذہن کو ایسے ہی مذہبی نظام کی ضرورت تھی۔ یونانی تصورِ حیات یقیناً بہترین تھا جیسا کہ گوئٹے کہتا ہے لیکن یہ تکلیف کی رنگ آمیزی سے محروم تھا جسے عیسائیت نے مہیا کیا تھا۔

ا۔ گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ "گوئٹے کی فاؤسٹ" صفحہ ۷۹)

۸۸۔ بڑا کتب خانہ

اگر آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ ہے اور اس میں موجود تمام کتب کے بارے میں آپ جانتے ہیں، تو یہ صرف ظاہر کرتا ہے کہ آپ ایک امیر آدمی ہیں ضروری نہیں کہ آپ ایک مفکر بھی ہوں۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا صرف یہ مطلب ہے کہ آپ کے پاس استطاعت ہے کہ زیادہ لوگوں کی فکری خدمات حاصل کر سکیں۔

۸۹۔ معجزات

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آیا معجزات رونما ہوئے یا نہیں۔ یہ تو صرف شہادت کا مسئلہ ہے جس کے متعدد پہلو ہو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا کسی قوم کے لیے معجزات پر یقین کرنا فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہے کیونکہ اس قسم کا یقین مافوق الفطرت کے احساس میں شدت پیدا کرتا ہے، جس سے قدیم معاشروں اور ان معاشروں (مثلاً اسلام) کے باہمی تعلق سے تقویت ملتی ہے جن کی قومیت تصوراتی ہے نہ کہ علاقائی۔ معاشرتی ارتقا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معجزات پر یقین قریب قریب ایک ضرورت دکھائی دیتا ہے۔

۹۰۔ جمہوریت

جمہوریت ضابطہ پسندی کی روح کو فروغ دینے کا رجحان رکھتی ہے۔ یہ فی نفسہٖ بُری چیز نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے یہ خالصتاً اخلاقی نقطۂ نگاہ سے احتراز کر کے 'غیر قانونی' اور 'غلط' کو ہم معنی بنا دیتی ہے۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے
(ضربِ کلیم)

۹۱۔ جمہوریت اور سامراجیت

مختلف یورپی اقوام کی سامراجی اولوالعزمی اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اہلِ مغرب جمہوریت سے بیزار ہیں۔ برطانیہ اور فرانس میں جمہوریت کے خلاف ردِعمل ایک نہایت معنی خیز مظہر ہے لیکن اس مظہر کو سمجھنے کے لیے علمِ سیاسیات کے طالبِ علم کو اس کی خالصتاً تاریخی وجوہات کی تفتیش اور ان کے انکشاف کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اسے گہرائی میں جانا چاہیے تاکہ وہ اس ردِعمل کی نفسیاتی وجوہات کو تلاش کر سکے۔

۹۲۔ اخلاقی درسی کتب

قدما نے شخصیات پیدا کیں، ہم اخلاقی درسی کتب لکھتے ہیں۔

۹۳۔ نوجوان مبلغین اور مسلم خاتون

سماجی اصلاح کے ہمارے نوجوان مبلغین کا خیال ہے کہ مغربی طریق پر تعلیم کے چند جرعے مسلم خاتون کے مردہ جسم میں دوبارہ جان ڈال دیں گے اور وہ اپنے قدیم حجاب کو پارہ پارہ کر دے گی۔ شاید یہ درست ہو۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے اپنے آپ کو برہنہ پا کر اُسے ان نوجوان مبلغین سے اپنے بدن کو ایک مرتبہ پھر چھپانا ہوگا۔

۹۴۔ شعرا اور سیاست دان

قومیں شعرا کے دلوں میں جنم لیتی ہیں ان کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں جب کہ وہ سیاست دانوں کے ہاتھوں مر جاتی ہیں۔

۹۵۔پیغمبر

پیغمبر محض ایک عملی شاعر ہوتا ہے۔

۹۶۔فلسفہ اور شاعری

فلسفہ' انسانی عقل کی سرد رات میں لرزتی ہوئی تجریدات کا ایک مجموعہ ہے۔شاعر آتا ہے اور انہیں گرما کر واقعیت میں بدل دیتا ہے۔

۹۷۔افلاطون اور گوئٹے

فطرت یکسر فیصلہ نہ کر سکی کہ افلاطون کو کیا بنایا جائے۔شاعر یا فلسفی۔ گوئٹے کے معاملے میں بھی وہ اسی تذبذب کا شکار رہی ہے۔

ا۔افلاطون: (۴۲۷ قبل مسیح ۔ ۳۴۸ قبل مسیح) سقراط کا شاگرد ۔حکیم اقلیدس سے بھی اس نے فیض حاصل کیا۔علمی دنیا میں اس کے مکالمات کی بڑی عزت ہے۔جمہوریت' افکار اور اعیان اس کے ایسے مکالمات ہیں جن کی وجہ سے اسے دنیا کا ایک عظیم فلسفی مانا جاتا ہے۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اَعراف!
(بالِ جبریل)

۲۔گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ ۷۹)

۹۸۔ روئے زمین پر دلکش چیز

ایک انتہائی خوبصورت عورت جسے اپنے حسن کا احساس نہ ہو میرے لیے خدا کی روئے زمین پر سب سے دلکش چیز ہے۔

۹۹۔ عقائد کے بغیر مطابقت

کسی عقیدے پر ایمان کے بغیر اس کے ساتھ رواداری بلکہ مطابقت کا اندازِ نظر سوقیانہ ذہن کے لیے شاید سب سے زیادہ حیران کن چیز ہے۔ اگر آپ کا نقطۂ نگاہ ایسا ہو تو خاموش رہیں اور کبھی بھی اپنے موقف کے دفاع کی کوشش نہ کریں۔

۱۰۰۔ راوی کے کنارے غروبِ آفتاب

آپ کے کتب خانہ کے تمام حیرت انگیز کتابی علم کی قدر راوی کے کنارے ایک پُر شکوہ غروبِ آفتاب کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

۱۰۱۔ حقیقی سیاسی زندگی

حقیقی سیاسی زندگی کا آغاز حقوق کے دعوے سے نہیں بلکہ فرائض کی ادائیگی سے ہوتا ہے۔

۱۰۲۔ حقیقی شادی کی اہمیت

فطرت کی خوبصورتی کا ادراک صرف ایک عاشق کی نگاہوں ہی سے ہو سکتا ہے۔اسی لیے ایک حقیقی شادی کی اہمیت ہے۔

۱۰۳۔ خدا اور شیطان

خدا اور شیطان دونوں انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں جس طرح وہ موزوں سمجھتا ہے ان کے استعمال کے لیے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

۱۰۴۔ شیطان کی یاد

شیطان کو یاد کرو تو یقیناً اسے موجود پاؤ گے۔یہ خدا کے لیے بھی یکساں سچائی ہے۔

۱۰۵۔ شکر گزاری

اے خدا! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تُو نے مجھے اس جہاں میں پیدا کیا جس میں گلابی صبحیں، شعلہ پوش شامیں اور گھنے جنگل ہیں، جن کی آغوش میں فطرت کی گزری ہوئی راتوں کی اداسی ابدیت کی نیند سوتی ہے۔

۱۰۶۔ ماہر نفسیات اور شاعر

ماہر نفسیات تیرتا ہے جبکہ شاعر غوطہ زن ہوتا ہے۔

۱۰۷۔ صداقت نامے جمع کرنے کی جبلّت

ہندوستانی خاندانوں کی ایک مخصوص جماعت میں، جو کہ زیادہ تر برطانوی راج کے آلہ کار ہیں۔ مختلف افسران سے صداقت نامے جمع کرنے اور ان کی اشاعت کا رجحان بڑھ کر جبلت کی صورت اختیار کر چکا ہے جو کبھی کبھی نئی نسل میں قبل از وقت ظاہر ہوتا ہے۔ میں اسے اخلاقی کمزوری کی ایک قسم کے طور پر دیکھتا ہوں جو ایک غیر صحت مندانہ ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔

۱۰۸۔انسانی دماغ کا گہرا جائزہ

اگر آپ انسانی دماغ کا تجزیاتی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو وُنڈ' وارڈ' جیمز یا سٹاوٗٹ سے رابطہ کرنا چاہیے۔لیکن انسانی فطرت کے متعلق ایک حقیقی بصیرت آپ گوئٹے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۔ ولیم میکس وُنڈ: (۱۶ اگست ۱۸۳۲ء۔ ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء) جرمن فلسفی' معالج' ماہر نفسیات ۔ جدید نفسیات کا ایک اہم نام۔ ڈنڈ 'تجرباتی نفسیات کے باپ' کے طور پر جانا جاتا ہے۔

۲۔ جیمز وارڈ: (۲۷ جنوری ۱۸۴۳ء۔ ۴ مارچ ۱۹۲۵ء) انگریز ماہر نفسیات اور فلسفی۔اس نے نفسیات پر متعدد کتب تحریر کیں۔وہ ۲۰۔۱۹۱۹ء میں ارسطوسوسائٹی کا صدر بھی رہا۔

۳۔ ولیم جیمز: (۱۱ جنوری ۱۸۴۲ء۔ ۲۶ اگست ۱۹۱۰ء) امریکی ماہر نفسیات اور فلسفی۔امریکہ میں نفسیات کے مضمون کا پہلا باقاعدہ معلم۔اس کی کتابوں 'اصولِ نفسیات' اور 'نفسیاتِ وارداتِ روحانی' کو بہت شہرت ملی۔

۴۔ جارج فریڈرک سٹاوٗٹ: (۱۸۶۰ء۔۱۹۴۴ء) ممتاز انگریز ماہر نفسیات اور فلسفی ۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ نفسیات کے رسالے 'مائنڈ' کا مدیر تھا۔۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۴ء تک ارسطوسوسائٹی کا صدر رہا۔

۵۔ گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ ۷۹)

۱۰۹۔ انسان اور ابدیت

جیسے چشمے کے کنارے پر اُگنے والا ایک پودا، میٹھی چاندی جیسی موسیقی کو نہیں سنتا جو تہہ آب پر اسے پروان چڑھاتی ہے۔ اسی طرح انسان، کہ جو ابدیت کے کنارے پر نشو ونما پاتا ہے اُس خدائی دھیمی سُر سے ناواقف ہے جو اُس کی روح کی زندگی اور ہم آہنگی کی خالق ہے۔

۱۱۰۔ شاعر بحیثیت انسان

آ پیارے دوست! تُو مجھے ایک تجریدی مفکر اور اعلیٰ مقاصد کے خواب دیکھنے والے کے طور پر جانتا ہے۔ مجھے اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ کھیلتا اور باری باری لکڑی کے گھوڑے کی طرح انہیں اپنے اوپر سوار کراتا دیکھ۔ ہائے! مجھے خاندان کے درمیان اپنی سرمئی بالوں والی ماں کے قدموں سے لپٹا ہوا دیکھ جس کے ہاتھ کا لمس وقت کے طوفانی دھارے کا رُخ پلٹ کر مجھے دوبارہ جوان بناتا ہے اور مجھے ایک مرتبہ پھر سکول جانے والے بچے کا احساس دلاتا ہے باوجودیکہ میرے تخیل میں کانٹ اور ہیگل کا فلسفہ وحکمت ہے۔ یہاں تُو مجھے ایک بنی نوع انسان کے روپ میں جانے گا۔

۱۔ کانٹ (دیکھیے خیال نمبر ۶۹ ''کانٹ کا امر مطلق''، صفحہ ۹۲)

۲۔ ہیگل (دیکھیے خیال نمبر ۱۱ ''ہیگل کا نظامِ فلسفہ''، صفحہ ۴۵)

۱۱۱۔ فلسفہ اور شاعری کا اثر

فلسفہ بوڑھا کرتا ہے جبکہ شاعری تجدیدِ شباب کرتی ہے۔

۱۱۲۔ شیکسپیئر اور گوئٹے

شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں تخلیق کی خدائی سوچ پر نظر ثانی کرتے ہیں۔ تاہم ان کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ حقیقت پسند انگریز فرد پر نظر ثانی کرتا ہے جبکہ تصوراتی جرمن بنی نوع انسان پر۔ اُس کی فاؤسٹ محض دیکھنے میں فرد ہے۔ در حقیقت وہ انسانیت کی تجسیم ہے۔

۱۔ ولیم شیکسپیئر: (۲۶ اپریل ۱۵۶۴ء۔ ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء) انگریز شاعر اور انگریزی ادب کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار۔ ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۲ء کے درمیان اُس نے لندن میں کامیاب اداکار اور مصنف کے طور پر کام کیا۔ شروع میں اُس نے زیادہ تر مزاحیہ اور تاریخی ڈرامے لکھے۔ اقبال نے اپنی نظم ''شیکسپیئر'' میں اس کو یوں داد دی ہے:

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا
(بانگِ درا)

۲۔ گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ ۷۹)

۱۱۳۔ لمحے کی قدر و قیمت

میں دنوں، مہینوں اور سالوں کی قدر و قیمت ان تجربات سے جانچتا ہوں جن سے وہ مجھے روشناس کراتے ہیں اور بعض اوقات مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک لمحہ پورے سال سے زیادہ قابلِ قدر ہوتا ہے۔

۱۱۴۔ تجربہ اور علم

ہر تجربہ انسان کی روح سے کچھ اخذ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ گناہ کا تجربہ آپ کی روح کے کچھ ایسے پہلوؤں کو ظاہر کردیتا ہے جن سے آپ پہلے آگاہ نہیں تھے۔ تجربہ اس طرح علم کا دوہرا سرچشمہ ہے۔ یہ آپ کو اس شے کی بصیرت عطا کرتا ہے جو آپ کے وجود کے باہر ہے اور اس شے کی بھی جو آپ کے وجود کے اندر ہے۔

۱۱۵۔ معمولی حقائق

روزمرہ واقعات سے زیادہ معمولی کچھ نہیں۔تاہم نوعِ انسانی ان سے ناآشنا تھی جب تک کہ بیکن نے ان کی آنکھیں نہ کھول دیں۔

۱۔برطانیہ میں بیکن نام کے دو عظیم دانشور پیدا ہوئے اور دونوں نے سائنسی تجربہ و تحقیق میں ناموری حاصل کی' ایک راجر بیکن (۱۲۱۴ء ۔۱۲۹۴ء) اور دوسرا فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء۔ ۱۶۲۶ء) ۔ افتخار احمد صدیقی مرحوم کے نزدیک یہاں اول الذکر مراد ہے (دیکھیے صفحہ ۱۶۱ شذراتِ فکرِ اقبال) جبکہ خرم علی شفیق کے مطابق یہاں فرانسس بیکن مراد ہے (دیکھیے صفحہ ۳۳۴ اقبال: تشکیلی دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء)

۱۱۶۔ ہوریس' مونٹین اور آزاد

''ہم تو ایسے دھکیلے جاتے ہیں' جیسے لکڑی بہتی ہے'
کوئی طاقت اِدھر سے اُدھر لیے پھرتی ہے''

مونٹین' ہوریس کی ان درج بالا سطور پر ان الفاظ میں رائے زنی کرتا ہے:

''ہم جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں، ان چیزوں کی طرح جو کہ پانی کے پُر سکون طوفانی بہاؤ میں کبھی آہستہ سے اور کبھی بے قابو ہو کر بہتی چلی جاتی ہیں''۔

مونٹین کی اس عبارت کے ٹکڑے کو پڑھتے ہوئے مجھے آزاد مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا جنہوں نے اس خیال کو ہوریس اور مونٹین سے زیادہ حسین انداز میں بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

ا۔قیونٹس ہوریٹس فلاکس: (۸ دسمبر ۶۵ قبل مسیح ۔ ۲۷ نومبر ۸ قبل مسیح) اطالوی شاعر، ہوریس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلا شخص جس نے اپنی کتاب 'ارس پوئیٹیکا' میں فن کی مختلف اصناف کو ایک ہی سلسلے میں منسلک کر کے ان پر سیر حاصل بحث کی۔
۲۔ مائیکل ایکیوم ڈی مونٹین: (۲۸ فروری ۱۵۳۳ء ۔ ۱۳ ستمبر ۱۵۹۲ء) فرانسیسی ادیب۔ادبی صنف کے طور پر اُس کے مضامین وجہ شہرت بنے۔
۳۔محمد حسین آزاد: (۱۸۳۰ء ۔۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء) اُردو ادب کا مشہور انشا پرداز۔ اس نے شاعری بھی کی لیکن اپنی نثر کی وجہ سے شہرت پائی۔ قصص الہند، نیرنگِ خیال، آبِ حیات، دربارِ اکبری اور سخن دانِ فارس اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

۱۱۷۔ ادبی تنقید

ادبی تنقید لازماً تخلیقِ ادب کا ساتھ نہیں دیتی۔ جرمن ادب کے آغاز میں ہی ہمیں لیسنگ ملتا ہے۔

۱۔لیسنگ: مصنفین اور فن کاروں کا جرمن خاندان۔ جس کے مشہور ادیب درج ذیل ہیں:

جوہان گوٹفرائڈ لیسنگ (۱۶۹۳ء۔۱۷۳۰ء)

گوٹ ہالڈ ایفرائم لیسنگ (۱۷۹۲ء۔۱۷۸۱ء)

کارل گوٹھلف لیسنگ (۱۷۴۰ء۔۱۸۱۲ء)

کارل فریڈرک لیسنگ (۱۸۰۸ء۔۱۸۸۰ء)

کرسچن فریڈرک لیسنگ (۱۸۰۹ء۔۱۸۶۲ء)

کارلوئس گوٹھالڈ لوڈوگ لیسنگ (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۷ء)

فرانز سکا فانی لیسنگ (۱۸۱۸ء۔۱۹۰۱ء)

کارل رابرٹ لیسنگ (۱۸۴۶ء۔۱۸۹۵ء)

اوٹو لیسنگ (۱۸۴۶ء۔۱۹۱۹ء)

برتھا لیسنگ (۱۸۴۴ء۔۱۹۱۴ء)

کانراڈ لیسنگ (۱۸۵۲ء۔۱۹۱۶ء)

ہینرچ لیسنگ (۱۸۵۶ء۔۱۹۳۰ء)

لیسنگ سے مراد یہاں جرمنی کے ادبی خاندان کے پہلے یا دوسرے مصنف میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔

۱۱۸۔ گوئٹے اور ہائنے

کوئی بھی قوم اہلِ جرمنی جیسی خوش نصیب نہیں۔ انہوں نے ہائنے کو اس وقت جنم دیا جب گوئٹے بھر پور انداز میں نغمہ سرا تھا۔ دو بے باک بہاریں۔

۱۔ کرسچن جوہان ہینرچ ہائنے: (۱۳ دسمبر ۱۷۹۷ء۔ ۱۷ فروری ۱۸۵۶ء) انیسویں صدی کا ایک ممتاز جرمن شاعر، صحافی، مضمون نگار اور ادبی نقاد۔ جرمن حکام نے اس کے بہت سے بنیاد پرست سیاسی خیالات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اُس نے زندگی کے آخری پچیس برس پیرس میں سکونت اختیار کی۔ اقبال، پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''اگرچہ اس کے مجموعہ اشعار موسوم بہ 'اشعار تازہ' میں عجمی اثر نمایاں ہے اور محمود فردوسی کے قصے کو بھی اس نے نہایت خوبی سے نظم کیا ہے تاہم بحیثیتِ مجموعی مشرقی تحریک سے اس کا کوئی تعلق نہیں''۔
۲۔ گوئٹے (دیکھیے خیال نمبر ۴۸ ''گوئٹے کی فاؤسٹ'' صفحہ ۷۹)

۱۱۹۔ حافظ

حافظ نے ترشے ہوئے ہیروں جیسے الفاظ میں بلبل کی سی میٹھی مد ہوش کرنے والی روحانیت ڈال دی ہے۔

۱۔ خواجہ شمس الدین شیرازی: (۱۳۲۶ء۔ ۱۳۸۹ء) فارسی زبان کا سب سے بڑا غزل گو۔ حافظ تخلص کرتا تھا۔ اس کی غزلیں لوگوں میں اپنی سادگی، رنگینی اور تاثیر کی وجہ سے بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ حافظ شیرازی کو ''لسان الغیب'' بھی کہا جاتا ہے۔

۱۲۰۔محبت ایک زندہ دل بچے کی طرح ہے

محبت ایک زندہ دل بچے کی طرح ہے۔ وہ ہماری انفرادیت کی تعمیر کرتی ہے اور پھر خاموشی سے ہمارے کانوں میں کہتی ہے۔''اسے چھوڑ دو''۔

۱۲۱۔حکمت کی تلاش

میں نے اکثر حکمت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ثابت قدمی کی چٹان کے پیچھے چھپاتی ہے۔

۱۲۲۔انسان خیالِ واحد کے ساتھ

اگر آپ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ دنیا کے شوروغل میں آپ کی آواز سنی جائے تو آپ کی روح پر کسی ایک خیال کو غالب ہونا چاہیے۔ یہ انسان ہی ہے جو خیالِ واحد کے ساتھ سیاسی اور سماجی انقلابات کی تخلیق کرتا ہے، حکومتیں قائم کرتا ہے اور دنیا کو قانون دیتا ہے۔

۱۲۳۔فن تنِ تنہا غیر محدود ہے

سائنس، فلسفہ، مذہب سب کی حدود ہیں۔فن تنہا غیر محدود ہے۔

۱۲۴۔ مطلق علم اور اخلاقی ترقی

تمام فلسفیانہ سوچ کا حاصل یہ ہے کہ مطلق علم کا حصول ناممکن ہے۔شاعر براؤننگ ایک دانشمندانہ دلیل سے اس عدم امکان کا اخلاقیات پر اطلاق کرتا ہے۔انسانی علم کی غیر یقینی صورتِ حال، شاعر کے مطابق، اخلاقی ترقی کی ایک ضروری شرط ہے کیونکہ یقینی علم انسانی انتخاب کی آزادی کو تلف کر دیتا ہے۔

ا۔رابرٹ براؤننگ: (۷مئی ۱۸۱۲ء۔۱۲دسمبر ۱۸۸۹ء) انگریز شاعر اور ڈرامہ نگار۔اس کا کلام عمیق و سنجیدہ خیالات کا حامل ہے اسی لیے وہ اقبال کے پسندیدہ انگریزی شعرا میں سے ہے۔

بے پشت بود بادۂ سر جوشِ زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم
(پیامِ مشرق)

۱۲۵۔ چاپلوسی

چاپلوسی محض مبالغہ آمیز حسنِ ادب ہے۔

Science, Philosophy, Religion all have limits. Art alone is boundless.

The result of all Philosophical thought is that absolute knowledge is an impossibility. The Poet Browning turns this impossibility to Ethical use by a very ingenious argument. The uncertainty of human knowledge, teaches the poet, is a necessary condition of moral growth; ~~teaches the poet~~, since complete knowledge will destroy the liberty of human choice. ~~Ingenious argument indeed!~~

Flattery is only exaggerated good manners.

Love is a playful child. She makes our individuality & then quietly whispers in our ears — "Renounce it".

I have often played hide and seek with wisdom; she conceals herself always behind the rock of determination.

If you wish to be heard in the noise of this world let your soul be dominated by a single idea. It is the man with a single idea who creates political and social revolutions, establishes empires and gives law to the world.

else, much more beautifully than either Horace or Montaigne. Says he:-

"جائے جز روان پرکار نہیں

سوار خاک پر ہے اعتبار نہیں"

× Literary criticism does not necessarily follow the creation of literature. We find Lessing at the very threshold of German literature.

× No nation was so fortunate as the Germans. They gave birth to Heine at the time when Goethe was singing in full-throated ease. Two ~~ease~~ uninterrupted Springs!

In words like cut-jewels Hafiz put the sweet unconscious ~~thoughts~~ spiritualities of the Nightingale.

Nothing is more common-place than facts; yet mankind are blind to them until Bacon opened their eyes.

"So are we drawn; as wood is shoved, By others' sinews each way moved".

Montaigne remarks on the above lines of Horace:—

"We go not, but we are carried, as things that float, now gliding gently, now hurling violently, according as the water is either stormy or calm".

While reading this passage in Montaigne I was put in mind of a verse by our late and lamented poet "Azad" who has given an expression to this

His Faust is a seeming individual only. In reality, he is humanity - individualised.

---

x I judge the worth of my days, months, and years from the experiences which they bring to me, and sometimes I am surprised to find that a single moment is more valuable than a whole year.

---

x Every experience evokes something from the soul of man. Even the experience of sin will reveal some aspect of your soul of which you ~~did~~ are not conscious ~~of~~ ~~these~~ before. Experience, then, is a double source of knowledge; it gives you an insight into what is without you, as well as an insight into ~~your own~~ what is ~~soul~~ within you.

my grayhaired mother the touch of whose rejuvenating hand ~~makes~~ bids the tide of time flow backward, and gives me once more the schoolboy feeling in spite of all the Kants and Hegels in my head! Here thou wilt know me as a human being.

X Philosophy ages; Poetry rejuvenates.

X Both Shakespeare and Goethe rethink the Divine thought of Creation. There is, however, one important difference between them. The realist Englishman Rethinks the individual; the idealist German, the universal.

you can get from Goethe alone.

As a plant growing on the bank of a stream heareth not the sweet silver-music ~~that sums~~ which sustains its ~~life~~ & so grows beneath, so man, growing out of the bank of infinity, ~~but~~ listeneth not to the divine undertone that maketh the life and harmony of his soul.

Come dear Friend! Thou hast known me only as an abstract thinker and dreamer of high ideals. See me in my home playing with the children giving them rides turn by turn as if I were a wooden horse! Ah! See me in the family circle lying in the feet of

The Psychologist reasons, the poet dives.

In a certain class of Indian families — mostly creatures of the British rule — the tendency to collect & print testimonials from various officials has grown into a sort of instinct, which reveals itself sometimes very early in the young offspring. I look upon it as a kind of moral infirmity developed by an unhealthy environment.

X If you wish to study the anatomy of the human mind you may go to Wundt, Ward, James or Stout. But a real insight into human nature

Both God and the Devil give ~~him~~ [man] opportunities only, leaving him to make use of them in the way he thinks fit.

"Think of the Devil and he is sure to appear". This is equally true of God.

~~The Psychologist scanning~~ [notwithstanding] ~~the peak dives into the deep of the human mind~~.

X God! I thank thee for my birth in this world of rosy-dawns, flame-clad sunsets and thick forests wherein the gloom of nature's bygone nights rests in eternal sleep!

The attitude of toleration even conformity without belief in dogma is probably the most incomprehensible thing to the vulgar mind. If such is your attitude, keep quiet and never try to defend your position.

All the wonderful book-lore in your library is not worth one glorious sunset on the banks of the Ravi.

True political life begins not with the claiming of rights, but with the doing of duties.

The beauties of nature can be realised only through the eyes of a lover. Hence the importance of a true marriage.

Philosophy is a set of abstractions
X shivering in the cold night of
human reason. The poet comes
and warms them up into
~~concreteness~~ objectivity.

Nature was not quite decided
what to make of Plato — poet
or Philosopher. The same ~~of~~
indecision she appears to
have felt in the case of
Goethe

X A woman of superb beauty with
a complete absence of self-
consciousness is to me the
most charming thing on God's
earth.

~~"Think of the Devil & he is sure
to come," is an old proverb. But it
is equally true of God.~~

Our young prophets of social reform think that a few doses of education on western lines will revitalise the dead Musalman woman, and make her tear her ancient shrouds. This is perhaps true. But I fear, finding herself naked, she will have once more to hide her body from the eyes of these young prophets.

Nations are born in the hearts of poets; they prosper and die in the hands of politicians.

A prophet is only a practical poet.

France is a very significant phenomenon. But in order to grasp the meaning of this phenomenon the student of Political Science should not merely content himself with the investigation & discovery of the more historical causes which have brought it about, ~~this reaction~~ he must go deeper & search the psychological causes of this ~~important~~ reaction.

The ancients ~~world~~ produced Personalities, we produce moral readers. They ~~taught virtue by her living embodiments; we illustrate her by stories of bad and good characters alone another character a learned man may be a rogue~~

those nationality is ideal & not territorial. Looked at from the standpoint of social evolution, then, belief in miracles appears to be almost a necessity.

x Democracy has a tendency to foster the spirit of legality; this is not in itself bad; but unfortunately it tends to displace the "purely" moral standpoint, and to make the illegal and the wrong identical in meaning.

The imperial ambitions of the various nations of Europe indicate that the westerns are tired of Democracy. The reaction against Democracy in England!

a rich man, not necessarily that you are a thinker. Your big library only means that your heavy purse is big enough to hire many people to think for you.

The question is not whether miracles did or did not happen. This is only a question of evidence which may be interpreted in various ways; the real question is whether belief in miracles is useful to a community. I say it is; since such a belief intensifies the sense of the supernatural which holds together primitive societies as well as those societies (e.g. Islam)

No religious system can ignore the moral value of suffering. The error of the builders of Christianity was that they based their religion on the ~~moral value~~ fact of suffering alone, and ignored the moral value of other factors. Yet such a religious system was a necessity to the European mind in order to supplement the beautiful but onesided Hellenic Ideal. The Greek dream of life was certainly the best, as Lecky says; but it was wanting in the color-element of suffering which was supplied by Christianity.

If you have got a big library & know all the books therein, this only shows that you are

Life, like the arts of poetry & painting, is wholly expression. Contemplation without action is death.

It is determination, not brains, ~~which~~ that succeeds in life.

If you wish to become a ~~public~~ public leader, you ought to know how to flirt with ~~the~~ the Dame Public. Entertain her with platitudes and, if necessary, with lies.

Recognise your limitations, estimate your capacities & your success in life is ~~secured~~ assured.

There is something of the plant in the ~~sluggish mind~~ the lazy mind; it cannot dance.

Nietzsche

~~Nietzsche thinks that biological truth demands a ~~the~~ complete rejection of all sympathy. But is not "sympathy" itself a product of biological evolution?~~

No one can fully understand the significance of Kant's Categorical Imperative who does not study the political history of the German people. The rigor of Kant's conception of Duty finds its full explanation there.

A diseased social organism sometimes sets up within itself forces which have a tendency to preserve the health of the organism — e.g. the birth of a great ~~#~~ personality which may revitalise the dying organism by the revelation of a new ideal.

8

The Powerful man creates environment; the feeble have to ~~f~~ adjust themselves to it.

Power toucheth Falsehood, & lo! it is transformed into Truth.

Civilisation is a thought of the Powerful man.

Give up waiting for the Mehdi — the Personification of Power. Go and ~~try to~~ create him.

---

x The idea of Nationality ~~is the ruling principle of modern Politics;~~ ~~and it~~ is certainly a healthy factor in the growth of ~~a~~ communities. But it is apt to be exaggerated and when exaggerated it has a tendency to kill the broad human element in Art & Literature.

God created things; man created the worth of things. The immortality of a people depends upon their incessant creation of worths. ([illegible] Nietzsche.) Things certainly bear the stamp of Divine manufacture; but their meaning is through and through human.

What is the law of things? Continual struggle. What must, then, be the end of Education? Evidently preparation for the struggle. A people working for intellectual superiority reveal thereby their feebleness.

Power is more divine than truth. God is power. Be ye, then, like your father who is in heaven.

History is only an interpretation of human motives; and, since we are liable to misinterpret the motives of our contemporaries and even of our intimate friends & associates in daily life, it must be far more difficult rightly to interpret the motives of those who lived centuries before us. The record of history, therefore, should be accepted with great caution.

The working power of an idea depends on the force of the personality in which it embodies itself. Muhammad, Buddha and Jesus Christ are the great embodiments of the idea of Equality, yet Islam is the only force in the world which is still working in the direction of Equality.

opinion, if not honest, (and unfortunately it is generally not honest) must lead to utter disintegration. The Mussalmans of India are now in the third stage; or, perhaps, partly in the second partly in the third. This period in the life of our community appears to me to be extremely critical; but I am glad that there are forces of a different nature at work which have a tendency to preserve the solidarity of the community — though their influence, I ~~[illegible]~~ afraid fear, can be only temporary.

~~The record of history should be accepted with great caution. In our everyday life we misinterpret human actions.~~

In so far as the evolution of religious ideas is concerned there are principally three stages in the development of a community:—

(1). The attitude of scepticism towards traditional religion — a revolt against dogma.

(2) But the need of religion as a social force of great value is at last felt; and then begins the second stage — an attempt to reconcile religion with reason.

(3) This ~~second~~ attempt leads necessarily to difference of opinion — ~~This stage is probably the most terrible state~~, for which may have awful consequences for the very existence of a community. Difference of

of colour does not attract him. The poet Mutanabbi, however, may be regarded as an exception; but then he is an Arab poet by language only; in spirit he is thoroughly Persian.

Wonder, says Plato, is the mother of all science. Bedil (Mirza Abdul Qadir) looks at the emotion of wonder from a different standpoint. Says he: —

"نزاکت هاست در آغوش مینا خانهٔ حیرت
مژه برهم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را"

To Plato wonder is valuable because it leads to our questioning of nature; to Bedil it has a value of its own irrespective of its intellectual consequences. It is impossible to express the idea more beautifully than Bedil:

religious character of his mind in spite of his scepticism. We must be careful in forming our opinion about the character of men from their habits of thought.

"There is my uncle's son walking along the edge of a precipice. Shall I go and, from behind, push him down the rocky valley to die without a dawn? Considering his treatment I am perfectly justified in doing so; but it is mean & unmanly to do such a thing."

So says the Arab poet in the Hamasa (?) This passage may be taken as a typical specimen of Arab poetry. No poetry is so direct, so straightforward & so manly in spirit. The Arab is intensely attached to reality; brilliancy

The fate of the world has been been principally decided by minorities. The history of Europe bears ample testimony to the truth of this proposition. It seems to me that there is a psychological reason why minorities minorities should have been a powerful factor in the history of mankind. Character is the invisible force which determines the destinies of nations, and an intense character is not possible in a majority. It is a force; the more it is distributed the weaker it becomes.

There are some people who are sceptical & yet of a religious turn of mind. The French Orientalist Renan reveals the identity

soon becomes insatiable. The experience of European countries clearly proves this deplorable fact. The absence of amusement in Muhammadan countries indicates neither poverty nor austerity nor bluntness of the sense for enjoyment; it reveals that the people of those countries find ample amusement and enjoyment in the social circles of their homes. The European critic ought not to be so hasty in his denunciation of the Muslim home. I admit that indifference to out-door amusement is not a necessary consequence of domestic happiness; nor does love of amusement necessarily mean domestic unhappiness.....

of Clive and Mahmud are ~~types~~ the representative types of such nations who such are unconscious agents of nature in the advancement of the world's industry. The robbery of Warren Hastings finds its true explanation in the history of European currencies in the 17th & 18th centuries.

The memory of man is generally bad except for the offences he receives from his fellowmen.

There are no amusements in Muhammadan countries — no theatres, no music Halls, no concerts; and better so. The desire for amusement once satisfied

The spendthrift is nature's own child. She does not like the accumulation of large masses of wealth in the hands of a few individuals. When the maker of a family succeeds in amassing a fortune, it often happens that in the third or even in the second generation a spendthrift appears and scatters the whole wealth. But for this agent of nature, the circulation of wealth would be clogged. What is true of the individuals is also true of the nations. When a nation, by industry or otherwise, amasses a hoard of wealth thus clogging the wheel of the world's industry the working of which depends on the continued circulation of money — robber nations appear on the scene & set the imprisoned wealth at liberty. Warren Hastings

x The Revolt Puritan theology of Milton cannot appeal to the imagination of our age. Very few people read him. Voltaire ~~was~~ is quite true in saying that Milton's popularity will go on increasing because nobody reads him. There is, however, one thing in Milton. No poet ~~has~~ has been ~~so~~ more serious about his task than him. His style — a gigantic architectural monument to false deities — ~~which seems to be the result of deep reflection~~ will always stand untouched by the relentless hand of time. ~~It is like a gigantic~~ ~~gigantic architectural monuments to false gods~~.

---

x The soul of Oscar Wilde is more Persian than Eng.

They believed themselves to be the chosen people of God — a belief which implies a perhaps justifiable contempt of other nations. He did not remember that the phrase White man's burden concealed the same Jewish belief in a different garb....

Goethe picked up an ordinary legend and filled it with the whole experience of the 19th century — nay the entire experience of the human race. This transformation of an ordinary legend into a systematic expression of man's ultimate ideal is nothing short of divine workmanship. It is as good as the creation of a beautiful universe out of the chaos of formless matter.....

too much to expect of man to love his enemies. ~~There may be~~ Some extraordinary individuals who may have realised this maxim in their life; but as a principle of national morality the ~~maxim~~ maxim clearly falls down. The results of the Russo-Japanese war would have been different if the Japanese had acted on the principles of morality associated with their religion.

~~Ideas never die~~ Individuals and nations die, but their children i.e. ideas never die.

An English gentleman once told me that he hated the Jews, but because

in Europe is at bottom a cry for husbands rather than votes. To me it is nothing more than a revolt of the unemployed.

It is Goethe's Faust — such the books supposed to have been written by the Galilean Fishermen — which reveals the spiritual ideals of the German nation. And the Germans are fully conscious of it.

Love is more than elixir. The latter is supposed to turn baser metals into gold; the former turns all the baser passions into itself. Christ and Buddha were absolutely correct in their perception of the nature of Love; but in their passion for Ethical Idealism they ignored the facts of life. It is

of a social & political nature are tending to enhance the number of women who cannot secure husbands. They cannot become mothers, and consequently they are driven to ~~seeks~~ seek interests other than the bringing up of children. They are compelled to "conceive" ideas instead of children. Recently they have conceived the inspiring idea of "votes for women". This is really an attempt on the part of the superfluous women, or if you like, ~~rather~~ an attempt on her behalf, to create "interests" for ~~her~~ in the sphere of politics. If a society cannot allow their women to produce & bring up children they must give them something else to ~~[illegible]~~ be occupied with. The suffragist movement

variety without escaping scot-free from the responsibility arising out of this indulgence. In England the individual does in some cases indulge in such inclinations, but the law leaves him absolutely free from the responsibility which may arise from his ~~indulgence~~ sexual freedom. He is not responsible for the education of the children he produces: ~~these children~~ nor can such children inherit their father. The consequences, in some cases, are awful. France has been compelled to recognise prostitution as a social institution which it is the duty of the State to keep healthy. But perhaps the greatest criticism on monogamy is the existence of the superfluous women in several European countries where various forces

The institution of Polygamy was never meant to be a universal institution. It was permitted to exist in order to meet certain difficulties which are not peculiar to Muslim Society alone. The worst of permitted things, according to Islam, is "Divorce". It ~~was~~ was partly to avoid "Divorce" becoming a common social phenomenon that ~~Polyg~~ Polygamy was tolerated. Of the two social evils divorce or Polygamy (evils of universalised) the latter is certainly the lesser. ~~Have I said that~~ But the avoidance of divorce is perhaps not the only justification ~~of~~ for this institution; it is partly a concession to the ~~male human~~ nature of the male who, according to this institution, is allowed to indulge in his inclination for

the progress of thought cannot be divorced from other phases of human activity. Our histories of Philosophy tell us what various people have thought, but they ~~do not tell~~ give us ~~the causes which~~ no information as to the various ~~about the~~ causes — social & political — which have determined the character of human thought. To write a complete history of ~~thought~~ Philosophy would certainly be a tremendous task. A mere theologian cannot fully reveal to his readers the rich content of Luther's Reform. We are apt to isolate great ideas from the general stream of ~~human~~ man's intellectual activity.

Modern Science ought not to mock
at ~~Philosophy, or more particularly~~ Metaphysics, —
for it was a metaphysician —
Leibnitz — who first gave Science
her working idea of matter. The
"Substance", said he, is essentially
"force", "resistance". Borrowing this
notion from Metaphysics Science
devotes herself to the study of the
behaviour of this force.
And it is clear that she could
not have discovered it for herself.

Ideas act & react on each other.
The growing spirit of Individualism in
Politics is not without its influence
on contemporary (cotemporary?)
Scientific thought. Modern thought
regards the Universe as a
democracy of living atoms.

---

type of genius.

x In the development of Universal civilisation the Jewish factor cannot be regarded as a negligible quantity. The Jews were probably the first framers of the principle of business-morality summed up in the idea of Righteousness.

x The true sphere of Mazzini was literature, not politics. The gain of Italy is not much compared to the loss which the world has suffered by his devotion to Politics.

I confess I owe a great deal to Hegel, Goethe, Mirza Ghalib, Mirza Abdul Qadir Bedil and Wordsworth. The first two led me into the "inside" of things; the 3rd & 4th taught me how to remain oriental in spirit and expression after having assimilated foreign ideals of poetry, and the last saved me from Atheism in my student days.

To explain the deepest truths of life ~~[illegible]~~ in the form of homely parables requires extraordinary genius. Shakespeare, Maulana Rūm (Jalaluddin) and Jesus Christ are probably the only illustrations of this rare

disinterested foreign rule is an impossibility. Yet the tutelage of nations is a necessity; ~~with tuition sometimes~~ ~~purchased at~~ Nations sometimes have (abundant) tuition by the fee paid for this tuition is sometimes a nation's daily bread. The Mexicans had to undergo a severe training ~~under~~ at Spaniards before they ~~could~~ they could undertake to manage their own affairs.

* The popularity of a poem does not depend on the amount of logical truth ~~any~~ revealed in it. Goldsmith's "Deserted Village" is extremely popular; yet the poem is full of scientific inaccuracies and bad economic reasoning.

Aryan mother, and the sterling character of his Semitic father.

But for the conquest of Persia ~~the~~ the civilisation of Islam would have been ~~could have been an Muslim civilisation~~ one-sided. ~~the conquest~~ The conquest of Persia gave us what the conquest of Greece gave to the Romans.

As far as I ~~do~~ can see Mirza Ghalib — the Persian Poet — is probably the only permanent contribution that we — Indian Muhammadans — have made to the general Muslim literature. Indeed he is one of those poets whose imagination and intellect place them above the narrow limitations of creed and nationality. His recognition is yet to come.

Political method was certainly very rough; but the ethical worth of his method ought to be judged from the standpoint of the age in which he lived and worked.

If you ask me what is the most important event in the History of Islam, I shall say without any hesitation — "The conquest of Persia". The battle of Nehawand gave the Arabs not only a beautiful country but also an ancient civilisation; or ~~rather~~ more properly, a people who could make a new civilisation with the Semitic and the Aryan material. Our Muslim civilisation is a product of the cross-fertilisation of the Semitic & the Aryan ideas. It is a child ~~whose mother~~ who inherits the softness & refinement of his

It was Lord Curzon who first
perceived the truth about the
power of England in India. ~~The~~
Hindu Nationalism is wrongly
attributed to his policy. Time
will, I believe, show that it
owes its existence to the
policy of Lord ~~Lytton~~ Ripon. It
is, therefore, clear that ~~both~~
in their ~~ultimate~~ political ~~aims~~ purpose goal and
~~their political~~ perceptions both the
Moghals and the English agree.
I see no reason why the
English historian should condemn
Aurangzeb ~~whose policy he~~
~~has policy his countrymen~~
~~have~~ whose Imperial Ideal his
countrymen have followed, & ~~[illegible]~~
~~Political~~ whose political perception
they have corroborated. Aurangzeb's

on the goodwill of the people of this land ~~find~~ as on the strength of the ruling race. ~~However~~ With all his keen political perception, however, he could not undo the doings of his forefathers. Sivaji was not a product of Aurangzeb's reign; ~~he was~~ the Maratha owed his existence to social and political forces called into being by the policy of Akbar. Aurangzeb's political perception, was though true, was too late. Yet considering the significance of this perception he must be looked upon as the founder of Musalman nationality in India. I am sure posterity will one day recognise the truth of what I say. Among the English administrators of India

in the hope that he would be able to unify the discordant political units of India in his own life-time. He failed to Islamise (in the ~~sense of~~ religious sense) India just as Alexander had failed to Hellenise Asia. The Englishman, however, came fully equipped with the political experiences of other than the nations of antiquity and his tortoise-like patience and perseverance succeeded where the hasty genius of Aurangzeb had failed. Conquest does not necessarily mean unity. Moreover the history of the preceding Muhammadan dynasties had taught Aurangzeb that the strength of Islam in India did not depend, as his great ancestor Akbar had thought, ~~on~~ so much

this great prophet of Aristocracy is unanimously condemned in Europe. Only a few have realised the meaning of his madness.

The Political ~~sentiments~~ genius of Aurangzeb was extremely comprehensive. His one aim of life was, as it were, to subsume the various communities of this country under the notion of one ~~Emperor~~ universal Empire. But in securing this Imperial unity he erroneously listened to the dictates of his indomitable courage which had no sufficient background of Political experience behind it. Ignoring the factor of time in the Political evolution of ~~of Empires~~ his contemplated empire he ~~has~~ started an endless struggle

fullest admiration. I do not deny the truth contained in his criticism of his master's views; but I detest the spirit in which he chooses to approach them.

There are strange inconsistencies in the nature of man. If I marry a prostitute I indicate thereby that I do not object to such such nasty alliances. But if you make my conduct the subject of a ~~novel~~ story I take it ill — I condemn in theory what I permit in practice. The philosophy of Neitsche — at least in the domain of Ethics — is an attempt rationally to justify the conduct of Europe; yet

language of Semitic theology.

X The Jewish race has produced only two great men — Christ and Spinoza. The former sees God incarnated in the Son, the latter in the Universe. Spinoza was only a completion of the greatest teacher of his race.

X I have the greatest respect for Aristotle, not only because I (living in the 20th century) know him much better than the older generations of my community, but also because of his vast influence on the thought of my people. But the tinge, however, of ingratitude revealed in his criticism of Plato's Doctrine of Ideas withholds me from giving him my

Matthew Arnold defines Poetry as
criticism of life. That life is
criticism of Poetry is equally
true.

In the sphere of human thought
Muhammad, Buddha and Kant
were probably the greatest revo-
lutionaries. In the sphere of
action Napoleon stands un-
rivalled. I do not include
Christ among the worlds' revolutionaries,
since the movement initiated
by him was soon absorbed
by Pre-christian Paganism.
European Christianity seems to
me to be nothing more than
a feeble translation of
ancient Paganism in the

a source of perpetual consolation to many a distressed mind. – Nations are mothers of Ideals; but Ideals, in course of time, become pregnant and give birth to new nations.

Philosophy is the Logic of Right; History the Logic of Might. The canons of this latter Logic appear to be more sound than those of her sister-Logic.

The verdict of History is that buffer states have never been able to form themselves into great political units. So was the case with Syria – a buffer state between the Empire of Rome and that of the Persians. It seems difficult to forecast the future of Afghanistan.

behaviour is more of a Psychological ~~study~~ than a Political study. It seems that the ideal of Political freedom which is an absolutely new experience to him has seized his entire soul, turning the various streams of his energy from their wonted channels and bringing them to pour forth their whole force into this new channel of activity. When he has passed through this experience he will realise his loss. He will ~~find~~ be transformed into ~~himself~~ an ~~[illegible]~~ absolutely new people — new in the sense that he will ~~find [illegible]~~ no longer find himself dominated by the ethical ideals of his ancestors whose sublime fancies have been

In the Economy of nature each nation has a function allotted to it. The function of the German nation is the organisation of human knowledge. But they have recently started on a commercial enterprise which may give them an Empire, but they will have to suffer the displacement of a their higher ideal by the all-absorbing spirit of trade.

X

It is extremely interesting to watch the birth and growth of a new ideal among a people. O! the enthusiasm it inspires and the force with which it attracts all the energies of a people to one common centre. The modern Hindu is quite a

20 Times his

our perhaps religious education is quite sufficient for the Muhammadan girl. All subjects which have a tendency to Dewomanise and to de-muslamise her must be carefully excluded from her education. But our educationists are still groping in the dark; they have not yet been able to prescribe a course of study for our girls. They are, perhaps, too much dazzled by the glamour of western ideals to realise the difference between Islamism which constructs nationality out of a purely abstract idea ~~an idea, and "Westernism"~~ i.e. religion, and "Westernism", the very life-blood of whose conception ~~notion~~ of nationality is a concrete thing i.e. coun

From what I have said above on Islam and Patriotism it follows that our solidarity as a community rests on our hold on the religious principle. The moment this hold is loosened we are nowhere. Probably the fate of the Jews will befall us. And what can we do in order to tighten this hold? Who is the principal depository of religion in a community? It is the woman. The Mussalman woman ought to receive sound religious education, for she is virtually the maker of the community. I do not believe in an absolute system of education. Education, like other things, is determined by the needs of a community. For

against Idolatry in all its forms. What was to be demolished by Islam could not be made the very ~~basis~~ principle of its ~~structure~~ structure as a political community. The fact that the Prophet prospered and died in a place not his birth-place is perhaps a mystic hint to the same effect.

Justice is an inestimable treasure; but we must guard it against the thief of Mercy.

an Englishman is when his civilisation is denounced. The feeling in both cases is the same though associated with different objects. Fanaticism is patriotism for religion; Patriotism fanaticism for country.

Islam appeared as a protest against Idolatry. And what is Patriotism but a subtle form of Idolatry; a deification of a material object. The Patriotic songs of various nations will bear me out in my calling Patriotism a deification of a material object. Islam could not tolerate Idolatry in any form. It our eternal mission to protest.

reason is that his nationality does not depend on religion; it has has a geographical basis — his country. His fanaticism then is justly roused when you criticise his country. Our position, however, is fundamentally different. With us nationality is a pure *idea*; it has no material basis. Our only rallying point is a sort of mental agreement in a certain view of the world. If then our fanaticism is roused when our religion is criticised I think we are as much justified in our fanaticism as

All nations accuse us of fanaticism. I admit the charge — I go further and say that we are justified in our fanaticism. Translated in the language of Biology fanaticism is nothing but the principle of individuation working in the case of a group. In this sense all forms of life are more or less fanatical and ought to be so if they care for their collective life. And as a matter of fact all nations are fanatical. Criticise an Englishman's religion, he is immovable; but criticise his civilisation, his country or the behaviour of his nation in any sphere of activity — and you will bring out his innate fanaticism. The

and unambiguous language.
It, therefore, follows that
Ethical & intellectual elevation
of humanity - is contrary
to the interests of the
legal profession.

I confess I am a bit tired of metaphysics. But whenever I happen to argue with people I find that their arguments are always based on certain propositions which they assume without criticism. I am, therefore, driven to examine the value of these propositions. The practical in all its shapes draws me back to the speculative. It seems to me to be impossible to get rid of metaphysics altogether.

The Prof. of law owes his existence to the fact that people are dishonest, and that legislators cannot express themselves in clear

History is a sort of applied Ethics.
If Ethics is to be an experimental
Science like other Sciences it
must be based on the
revelations of human Experience.
A public declaration of this
view will surely ~~offend the~~
~~traditional [illegible]~~ shock the
susceptibilities ~~of~~ even of those
who claim to be orthodox in
morality, but whose public
conduct is determined by the
teachings of History.

strengthen personality we are really fighting against death — a shock which may dissolve the arrangement of forces we call Personality. Personal Immortality then lies in our own hands. It requires an effort to secure the immortality of the Person. The idea I have dropped here has far-reaching consequences. I wish I could have time to discuss the comparative value of Islam, Buddhism and Christianity from the standpoint of this idea; but unfortunately I am too busy to work out the details.

e.g. Humility, contentment, slavish obedience, modes of human action which have been erroneously dignified by the name of virtue. On the other hand High ambition, generosity, charity and a just pride in our traditions and power fortify the sense of personality. Personality being the dearest possession of man must be looked upon as the ultimate good. It must work as a standard to test the worth of our actions. That is good which has a tendency to give us the sense of Personality; that is bad which has a tendency to suppress and ultimately disintegrate Personality. By adopting a mode of life calculated to

possible that these forces should continue to work in the same direction as they are working in a living healthy personality? I think it is. Let human Personality be represented by a circle — which is only another way of saying that these forces result in describing a definite circle which may be obliterated by an upsetting of the arrangement of forces constituting it. How then can we manage to secure the continuance of this circle? Evidently by energising in a way ~~so as~~ calculated to assist ~~these~~ ~~the~~ constituting forces in their regular routine of work. You must give up all those modes of activity which have a tendency to ~~disin~~tegrate dissolve personality.

Personal immortality is not a State; it is a process. I think the distinction of spirit & body has done a lot of harm. Several religious systems have been based on this erroneous distinction. Man is essentially an Energy, a force, or rather a combination of forces which admit of various arrangements. One definite arrangement of these forces is Personality – whether it is a purely chance arrangement does not concern me here. I accept it as a fact among other facts of nature, and try to find out whether this arrangement of forces – so dear to us – can continue as it is. Is it then

that ultimately decide the destinies of nations. As a political force we are perhaps no longer required; but we are, I believe, still indispensable to the world as the only testimony to the absolute unity of God — Our value among nations, then, is purely evidential.

It is idle to seek logical truth in Poetry. The ideal of Imagination is Beauty not Truth. Do not then try to show a poet's greatness by quoting passages from his works which, in your opinion embody scientific truth.

"Let fools fight for the forms of Government" says Alexander Pope. I cannot agree with this Political philosophy. To my mind Government, whatever its form, is one of the determining forces of a peoples' character. Loss of Political Power is equally ruinous to a nations' character. Ever since their Political fall the Musalmans of India have undergone a rapid ethical deterioration. Of all the Muslim communities of the world they are probably the meanest in point of character. I do not mean to deplore our former greatness in this country; for, I confess, I am almost a fatalist in so ~~far~~, regard to the various forces

15th May 1910

Yesterday morning at about 4 I saw that glorious visitor of our hemisphere known as Halley's comet. Once in 75 years this superb swimmer of infinite space appears on our skies. It is only with the eyes of my grandsons that I shall see it again. The state of my mind was quite unique. I felt as if something indescribably vast had been closed up within the narrow limits of my clay: yet the thought that I couldn't see the wanderer again brought home to me the painful fact of my littleness. For the moment all ambition was killed in me.

Christianity describes God as Love; Islam as Power. How shall we decide between the two conceptions? I think the History of mankind & of the universe as a whole must tell us as to which of the two conceptions is truer. I find that God reveals Himself in History more as Power than Love. I do not deny the Love of God; I mean that, ~~God~~ on the basis of our historical experience, God is better described as Power.

Hegel's System of Philosophy is an ~~[illegible]~~ Epic poem in prose.

The best test of the truth of a proposition is not that it is derivable from certain premises, and does not contradict other propositions of established truth. To my mind a proposition is true not because of its logical consistency with propositions of established truth, but because of its practical utility, its workableness, its function.

X Belief is a great power. When I see that a proposition of mind is believed by another mind, my own conviction of its truth is thereby immensely increased

The satisfaction of vanity has an economic value with us. Call me <u>Sub-Asst. Surgeon</u> instead of <u>Hospital Asst.</u> and I am quite contented even if you do not increase my salary.

X

Excuse me a bit of cruel psychology. You fail in your enterprise, and now you wish to leave your home and try your luck in other climes.

It is not because your ambition has received a fresh spur from ~~been spurred by~~ your failure, but chiefly because you wish to hide your face ~~run away~~ from those who have witnessed your failure

---

mean by "believe", "existence", and "God" — especially by the last two — if they want an answer to their question. I confess I do not understand these terms; and whenever I cross-examine them I find that they do not understand them either.

Heart — "It is absolutely certain that God does exist."

Head — "But my dear boy! Existence is one of my categories, and you have no right to use it."

Heart — "So much the better, my Aristotle!"

to the poor is virtually given away to those who do not give anything to the poor. The non-charitable, therefore, are kept in their ~~condition~~ state of non-benevolence, and the benevolent man pays for them. This is the Economics of charity.

My friends often ask me "Do you believe in the Existence of God"? I think I am entitled to know the meanings of the terms used in this question before I answer it. My friends ought explain to me what they

Art is a sacred lie.

x

Our soul discovers itself when we come into contact with a great mind. It is not until I had realised the infinitude of Goethe's imagination that I discovered the narrow breadth of my own.

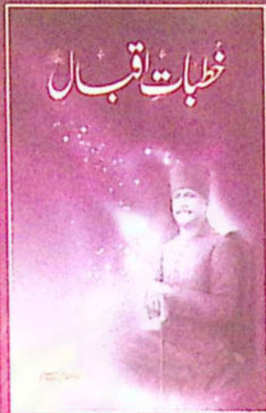
Human intellect is Nature's attempt at self-criticism

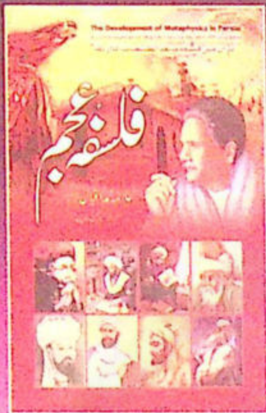
The charitable man really helps the non-charitable, not the indigent. For what is given

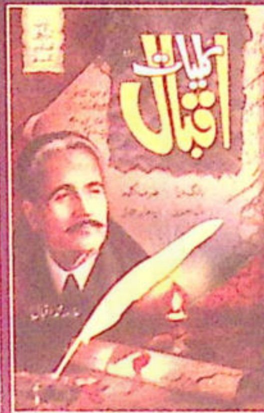
Stray ~~Thoughts~~ Reflections

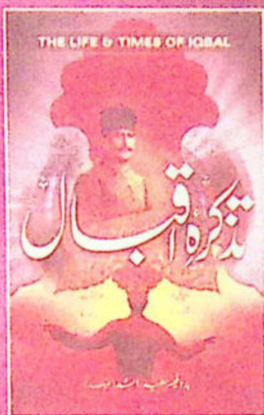
Muhammad Iqbal
27th April 10.

اقبالیاتِ بک کارنر





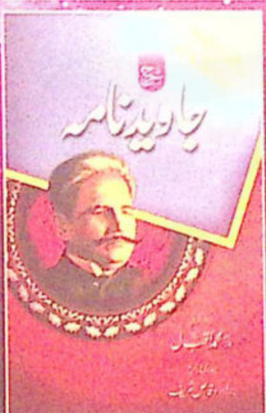


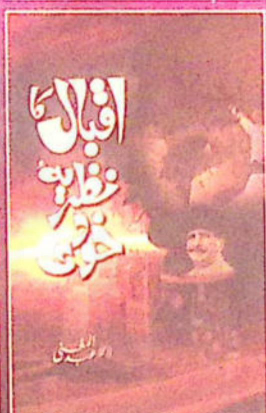












ناشران
بک کارنر
جہلم پاکستان

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
info@bookcorner.com.pk

ISBN [illegible]
Rs. 600.00

Title Design by: Ali Umama